حقوق محفوظ
جلد
سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر
طوفانِ اشک
تصنیف
مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ
جسے
رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے
عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا
قیمت
ایک روپیہ

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ کی ۲ نہایت مشہور

حیاتِ صالحہ یا صالحات علامہ محترم کی سب سے پہلی تصنیف جس نے

طوفانِ حیات جس کا ... ہیں

جادو نگار مصنف کے کمال افسانہ نگاری کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بجا دیا تھا اس میں ایک نیک لڑکی کی زندگی کے وہ تمام واقعات نہایت ہی موثر پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں جو اکثر ہندوستانی گھروں میں پیش آتے ہیں صالحات سے معلوم ہوگا کہ وہی باپ جو اولاد کا عاشق زار ہے، کس طرح بچوں کی جان کا دشمن اور خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، صالحات بتائیگی کہ جاہل ... کس طرح سوکن کے بچوں کی مٹی پلید کرتی ہے صالحات سے معلوم ہوگا کہ نیک کوک کی لڑکیاں مصائب کا کیسے کیسے ایثار اور قربانیوں سے مقابلہ کرکے دنیا کو حیرت میں ڈالدیتی ہیں مقصد کے ضمن میں آج سے چالیس سال پہلے کے گھرانوں کی معاشرت، رسم و رواج وغیرہ نہایت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں طرز تحریر کا کیا کہنا زبان وہی قلعہ معلی کی ... کوثر سے دھلی ہوئی واقعات اس قدر موثر کہ کلیجے کے پار ہوتے ہیں ہندوستانی دیہاتوں میں مستورات کے مطالب کے اس قدر بلند معاشرتی ناول بہت ہی کم لکھے گئے ہیں ملک کے مشہور انشا پرداز اور نقاد مولوی محمد ظفر حسن ام اے ایل ایل بی حیات صالحہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں سیرت نگاری میں مولانا نے کمال کر دیا ہے اسی پہلی ہی کتاب میں مولانا نے قلم توڑ دیا ہے کتاب کیا ہے ایک قیامت ہے جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے قیمت (عہ) علاوہ محصول

تھی جس کی تعریف میں اخبارات رطب اللسان تھے جس کا استقبال اردو علم ادب نے شاندار کیا تھا کئی سال سے نایاب اور ہزاروں شائقین اس کے منتظر بیچین تھے۔ اب عالم نسواں میں نہایت مسرت کے ساتھ سنا جائیگا کہ طوفان حیات پھر چھپ کر تیار ہے۔ قبیح رسوم اور شرک و بدعت معاشرہ کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکے ہیں مشکل سے کوئی گھر ہوگا جہاں ان لغویات کا دخل نہ ہو۔ اس کتاب کی ہیروئن مشرک کی زندگی اس قدر دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا ... ہو جاتا ہے وہ رسوم جنہوں نے مسلمانوں ... اڑا دیا اس وضاحت اور خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے کے بعد گھر میں ایسی رسموں کا نشان باقی نہیں رہتا۔ شرک جو دنیائے نسواں پر عام طور سے قابض ہے طوفان حیات کے مطالعہ کو سوں دور بھاگ جاتا ہے اور رسوم مروجہ فنا کے اژدہے کی صورت میں نظر آنے لگتی ہیں اور انسان خدائے واحد کی عظمت کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ مصنف کی دلچسپ زبان کی سلاست کے متعلق کچھ کہنا فضول ہوگا واقعات اسقدر دردناک ہیں کہ ہچکی بندھ جاتی ہے اعلیٰ کاغذ عمدہ چھپائی گو ہے قیمت صرف (عہ) علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:— مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

سلسلۂ عصمت نمبر ۱۷

وفانِ اشک

چند دردانگیز سبق آموز افسانے

از

ورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری مد ظلہ العالی

عصمت بک ایجنسی دہلی

سنہ ۱۹۳۲ء

طوفانِ اشک کے افسانے

عنوان	صفحہ

انتباہ و اطلاع

محروم وراثت

محمد احسن تحصیلدار کے دونوں بچے محسن اور رضیہ تھے تو حقیقی
بہن بھائی مگر نہ معلوم احسن کس طبیعت کا باپ تھا کہ اس کی وہی نظر
محسن پر پڑتی تو محبت میں ڈوبی اور رضیہ پر پڑتی تو زہر میں بجھی، سمجھدار پڑھا
لکھا، مگر ظالم کی عقل پر ایسے پتھر پڑے تھے کہ نہ دیکھکر خوش ہوتا نہ سوچ
کر نادم، محسن کی تعلیم پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا، مگر رضیہ غریب کو
استانی بھی میسر نہ تھی، کچھ اس لئے نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کا مخالف تھا بلکہ
اسلئے کہ وہ اپنی کمائی میں اسکو حقدار نہ سمجھتا تھا، محسن کے پاس جوتی کے
آٹھ آٹھ دس دس جوڑے اور رضیہ کے پاس صرف ایک اور وہ بھی جوتیوں
کی ٹوٹی پھوٹی تو نہیں، مگر ٹوٹی سے بدتر، محسن کے پاس ایک نہیں درجن بھر
سوٹ اور رضیہ کے پاس انے گنے دو دوپٹے اور لطف یہ کہ جو کچھ بھی رضیہ
کو میسر تھا وہ اس کا حق یا باپ کی محبت نہیں صرف صفیہ کا اصرار تھا
ورنہ واقعات تو یہی کہتے ہیں کہ رضیہ کھلے سر اور ننگے پاؤں بھی پھرتی
تو احسن کو ملال نہ ہوتا۔ باپ کی اس لاپرواہی اور بے وفائی پر بھی وقت
رضیہ کے ساتھ تھا، صفیہ جہاں شوہر کی اس کمی پر افسوس کر رہی تھی وہاں
اس نے اپنے فرائض کی ادائگی میں ہمیشہ اس نقصان کی تلافی کی۔ اور جہاں
تک بھی ممکن ہوا اس کی تعلیم و تربیت میں انتہائی کوشش کرتی رہی، رضیہ
کی فراست اس کا شوق اس کی سعادتمندی، صبر اور خاموشی ماں کے دل
میں گڑی جاتی تھی، وہ اس کے یا اس کے باپ کے سامنے نہیں تنہائی میں

اکثر روتی، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عید کے موقعہ پر اس لئے کہ کچھ عزیز آنے والے تھے، شامِ شام احسن نے بیوی اور بچے کے لئے بہت سامان منگوایا احسن، محسن، رضیہ، صفیہ، چاروں ایک جگہ بیٹھے تھے، احسن ایک ایک چیز اُٹھا اور دکھاتا جاتا تھا اور متوقع تھا، کہ بیوی اور اس کے بچے اس انتخاب کی داد دیں، احسن جس وقت ایک چیز دکھانے کے بعد صفیہ رضیہ اور محسن کی صورت دیکھ کر داد طلب کرتا اس وقت صفیہ اس ڈھیر کو کبھی شوہر کو اس امید پر دیکھتی اور تکتی کہ شاید اس ڈھیر سے یا شوہر کے منہ سے رضیہ کے لئے کوئی چیز یا رضیہ کا نام نکلے، مگر پوری نو چیزیں چار صفیہ اور پانچ محسن کی ختم ہوگئیں، لیکن رضیہ کے نام کی چیز نہ ڈھیری سے نکلی نہ اس کا نام باپ کے منہ سے نکلا۔ محسن نے باپ کی محبت اور کوشش کی داد دی، دل کھول کر دی اور پیٹ بھر کر دی، مگر صفیہ کے سامنے اس وقت ایک اور ہی سماں تھا، وہ اوپری دل سے تعریف کرتی رہی، لیکن ساتھ ہی خیال آیا، کہ اے معنی سامان بچیاں جو ماں کی جوتھٹ پر چند روزہ مہمان ہیں۔ بھائیوں کے مقابلہ میں اتنا حق بھی نہیں رکھتیں کہ پانچ کے مقابلہ میں ایک چیز آجاتی، میں جانتی ہوں کہ رضیہ کے پاس سب کچھ ہے۔ اور میں نے حیثیت سے زیادہ اور ضرورت سے بڑھ کر اس کا سامان کرلیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب باپ ہی کی کمائی کا ہے لیکن اس کے واسطے اگر ایک چیز بھی اس وقت آجاتی تو اس کا دل کتنا بڑھ جاتا، باپ اس کی خوشی دو چار روپے میں بھی مول نہ لے سکا، محسن خدا اس کی عمر دراز کرے آگے اور پیچھے آج اور کل مالک اور مختار ہے، لیتا ہے اور لے گا، مگر رضیہ کہاں اور یہ گھر کہاں،

صفیہ شوہر کے پاس سے ایک خفیف بخار دل میں لے کر اٹھی تھی، مگر کمرے تک پہنچتے پہنچتے بلبلا گئی، اور اس خیال کے آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، جانتی تھی کہ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیر رہے ہیں، اور چاہتی کہ اس حالت کو ظاہر نہ ہونے دے، مگر اس جذبۂ محبت نے جو ماما کی آغوش میں پلا تھا بے قابو کر دیا، اور بچی کی صورت دیکھنے کو منہ پھیرا۔ ایک ساکت مجسمہ تھا جو رضیہ کی صورت میں گم سم باپ کے سامنے بیٹھا زمین کو دیکھ رہا تھا، ماں نے بچی کی خاموش صورت دیکھ کر اس کے دل کی کتاب پڑھی اور ٹھنڈا سانس بھر کر آگے بڑھی، احسن بیوی کا یہ رنگ دیکھ کر حیرت میں ادھر آیا اور کہنے لگا،

"بس وہی ایک پٹنا کہ رضیہ کا کچھ نہ آیا، اس کے پاس سب کچھ موجود ہے"

بیوی:۔ "موجود تو محسن کے پاس بھی ہے"

میاں:۔ "محسن کی اس کی کیا برابری"

بیوی:۔ "کیوں؟"

میاں:۔ "وہ گھر کا مالک یہ پرایا دھن"

بیوی:۔ .. ..

میاں:۔ اس کے علاوہ کواری بچی کو جو مل گیا وہ غنیمت ہے۔

بیوی:۔ .. ..

(۲)

محسن بی اے میں کامیاب ہوا تو رضیہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھی، اور ایک یہی کیا ماں کی توجہ اور کوشش نے نسوانیت کے تمام جواہرات اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دئے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کی شادی

ساتھ ساتھ ٹھہری، مگر اس احتمال سے کہ موروثی جائداد رضیہ کی وساطت سے پرائے قبضہ میں نہ جائے احسن نے اس کے نکاح سے قبل قریب قریب تمام جائداد وقف علی الاولاد کی آڑ میں محسن کے حوالہ کی اور رضیہ کو محروم کر دیا، صفیہ نے بہتیرا غل مچایا، مگر یہ تو بڑا کام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بیویوں کی مخالفت کا شوہروں کے مقابلہ میں جو نتیجہ ہو سکتا ہے، مسلمان اس راز سے اچھی طرح آشنا ہیں، صفیہ کو بڑا صدمہ یہ تھا کہ اُس کی اپنی جائداد بھی جو میکے سے ملی تھی اس سلسلہ میں فنا ہو رہی تھی۔

مسلمان قلم کی طاقت اور اپنی زبان کے زور سے جھٹلا لیں، مگر ہے کوئی مسلمان جو ایمان سے کہہ سکے کہ بچوں والی بیوی، بہو اور داماد والی یا ہونے والی شوہر کی اتنی مخالفت کے بعد کہ ایسی دستاویز پر دستخط نہ کرے اس کے گھر میں خوش رہ سکتی ہے؟ احسن کے پنجرے میں رضیہ ہر چند پھڑ پھڑائی مگر معاشرت اسلامی کا موجودہ لاسہ اتنا تیز اور اتنا گہرا تھا کہ جلنی تڑپی اتنی ہی چپکی، گھر میں ہفتہ بھر قیامت بپا رہی اور اس کے بعد احسن نے اندر کی آمد و رفت قطعًا بند کر دی، صفیہ برس چھ مہینہ کی بیاہی نہ تھی بیس بائیس برس کی گھر تین نہایت ہی استقلال سے شوہر کا مقابلہ کیا اس حالت اور ایسے موقعوں پر مسلمان مردوں کے پاس نکاح ثانی کا حربہ چلتا ہوا ہتیار رہے، مگر صفیہ اس کو بھی خاطر میں نہ لائی اور میاں سے صاف کہدیا کہ گھر اگر موم دنون کا ہے کہ دھوپ سے پگھلے اور پانی سے بہے، تو میں کہاں تک روکوں گی۔ بسم اللہ آج نہ کیا کل اور کل نہ کیا پرسوں۔

مطالبہ حقوق نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے والے مسلمان جو کچھ

فرمائیں ہمارے سر اور آنکھوں پر، مگر خدارا وہ بتائیں کہ اس موقعہ پر جب احسن نے ہر طرف سے ناکام ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ رضیہ کے نکاح ہی کا خاتمہ کر دے اور تمام عمر بیٹی کو وداع نہ کرے۔ تو صفیہ کیا کرتی، اس فیصلہ نے صفیہ کی گردن شوہر کے سامنے جھکوا دی، اس کی اکڑ، اس کا استقلال، اس کا ضبط سب فنا ہو گئے، اور اب جائداد اور جائداد کی تقسیم تو الگ رہی اس کو نکاح ہی کے لالے پڑ گئے اور یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے غریب بچی کی عمر تباہ و برباد ہوتی ہے، اس نے کاغذ پر دستخط کئے، اور اس طرح رضیہ ماں باپ کی جائداد سے محروم وداع ہو کر سسرال رخصت ہوئی۔

(۴)

محسن بی اے کے بعد قانون میں کامیاب ہوا، رضیہ ایک بچہ کی ماں بنی، صفیہ حج سے فارغ ہوئی، احسن پر فالج گرا اور وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہا، اس وقت گھر کا مالک اور سپید و سیاہ کا مختار جائداد کا منتظم محسن تھا اور گو آمدنی معقول تھی، اللے تللوں نے مقروض کیا، اور نوبت یہاں تک آئی کہ جس گھر میں دس پانچ ہزار روپیہ ہر وقت موجود رہتا تھا، اس میں سو پچاس بھی مشکل سے نکل سکتے تھے، صفیہ کی دور اندیشی تھی کہ کچھ روپیہ اپنے پاس لگا رکھا تھا۔ باقی زیور سے مدد لی اور حج کر لیا۔ واپس آئی تو محسن کا یہ رنگ دیکھ سناٹے میں رہ گئی۔ مگر جو لڑکا زندہ باپ کو مردہ سمجھ رہا تھا وہ ماں کو کیا خاطر میں لاتا، محسن کی بعض دفعہ پریشانیاں اور پریشانیاں نہیں فضول خرچیاں ماں کو سخت خلجان میں ڈال دیتیں، اور وہ اب یہ سمجھ گئی تھی کہ عنقریب یہ مجھ سے روپیہ طلب کرتا ہے

اس لئے گھر کی برابر والی مسجد کی تعمیر اس کے واسطے بہت اچھا موقعہ تھا، اس نے فوراً شوہر کے کان میں بات ڈال کر جو کچھ زیور بچا تھا مسجد کی نذر کیا، مگر یہ خبر احسن اور صفیہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ تھی کہ فالج کا دورہ ایسا سخت ہوگا، اور سنگ دل باپ محسن، عاشق زار باپ کو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلادیگا صفیہ کے پاس ابھی تھوڑی بہت کھرچن موجود تھی اس کے طفیل اتنا تھا کہ معمولی علاج جاری رہا، ڈاکٹر حکیموں کی فیس نکل رہی تھی اور نسخے بھی آرہے تھے، ورنہ محسن نے ایک دن کو کیا ایک گھڑی بلکہ ایک لمحہ کو بھی نہ پوچھا کہ کیا ہوا اور کیا ہورہا ہے، جب متواتر باپ نے بلایا تو کھڑے کھڑے آیا اور ایک آدھ بات کی اور چلتا ہوا۔

احسن کے پندرہ روز اسی طرح گذرے، اُٹھ سکتا تھا اور نہ بیٹھ سکتا اس موقعہ پر صفیہ نے ایسی خدمت کی جو شریف بیویوں سے توقع کی جا سکتی ہے، اس کو سوا رونے کے اور کوئی کام نہ تھا، رات رات بھر اور دن دن بھر پٹی پکڑے بیٹھی رہی، اس کی نیند اور بھوک دونوں اڑ چکی تھیں اور اسی کا صدقہ تھا کہ حکیم ڈاکٹر آرہے تھے اور علاج ہورہا تھا۔ بالآخر ڈاکٹر نے بجلی کا علاج تجویز کیا، جس کا تخمینہ چار ہزار روپے کے قریب تھا، احسن اور رضیہ دونوں کو یہ شبہ بھی نہ تھا کہ محسن باپ ہی کا روپیہ جس کی بدولت وہ نواب بنا پھر رہا تھا، باپ کی زندگی اور راحت سے عزیز کرے گا۔

صبح سے بلاتے بلاتے شام ہوگئی، دنیا نظر آئی مگر محسن

نہ آیا، خدا خدا کر کے شام کو لوٹا تو باپ نے اپنے منہ سے ساری کیفیت سنائی اور چار ہزار روپے مانگے بے وفا مسکرا کر اُٹھا اور بغیر جواب دئے چلا تو ماں پیچھے پیچھے گئی اور کہا :-

"میاں پھر بجلی کے علاج کا انتظام کرو"

ایک ایسی نظر سے جس میں تعجب اور غصہ دونوں شامل تھے، محسن نے ماں کو دیکھ کر کہا

"تمہاری تو عقل جاتی رہی ہے۔ اول تو روپیہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہوتا بھی تو علاج فضول ہے، میں نے معلوم کر لیا کہ موت یقینی ہے، اگر کچھ روز کو بچ گئے تو اور سوہانِ روح ہوں گے"

صفیہ کا قدم آگے نہ اُٹھ سکا، دہم ہو گئی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اُس کو تو کچھ نہ کہہ سکی مگر اپنے دل میں کہا کہ ایسے ناہنجار لڑکے کی ماں زمین شق ہو اور سما جائے اب میں جا کر کیا جواب دوں" کھڑی سوچ رہی تھی کہ رضیہ کا خط ملا :

امّا جان !

آداب عرض کرتی ہوں۔

جب سے ابّا جان کی بیماری اور اُن کی کیفیت سنی ہے دل ہوا ہو رہا ہے

ہائے میرے ابا جان کو کیا ہو گیا، میں تو بھلا چنگا چھوڑ کر آئی تھی۔ مجھ بدنصیب کو تو ابھی معلوم ہوا ہے، اے اللہ! کیا کروں؟ ڈپٹی صاحب کچہری میں ہیں جس طرح ہوگا آج ہی رات کو یا کل فجر حاضر ہوں گی۔ میرے آنے کا ذکر نہ کیجئے خفا ہوں گے۔ میں سامنے نہ جاؤں گی۔ دور ہی سے شکل دیکھ لوں گی

اچھی اماں جان! علاج میں کمی نہ کرنا۔

آپکی فرمانبردار بیٹی -
رضیہ

(۴)

رضیہ علی الصباح میکے پہنچی باپ کی حالت اور مفصل کیفیت سن کر الٹے پاؤں واپس گئی، رات کے دس بجے تھے، احسن یہ سن کر کہ محسن نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ انگاروں پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا، مگر مجبور تھا کہ ہلنے کی طاقت نہ تھی اور کوئی دم کا مہمان تھا آنکھیں بند تھیں کہ ایک ہاتھ نے اس کا مفلوج ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ احسن نے آنکھ کھولی تو دیکھا۔ رضیہ سامنے کھڑی ہے اور آنکھ سے آنسو بہ رہے ہیں۔

وہ یہ سمجھ کر کہ باپ کو میری صورت سے تکلیف نہ ہو

ہاتھ جوڑتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی، تو صفیہ نے کہا"
"رضیہ یہ چار ہزار روپے لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے
جو پانچ ہزار روپے اس کو نقد دئے تھے اس میں سے یہ
لے لیجئے" اور علاج کیجئے"!

جس رضیہ کی صورت سے باپ کو نفرت تھی۔ جس پر ایک پیسہ
بھی صرف کرنا گراں تھا۔ اس کا سر اس وقت باپ کے
قدموں میں تھا

اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے،

" ابا جان یہ آپ ہی کا روپیہ ہے میرا نہیں ہے"۔
آج احسن کو معلوم ہوا کہ بھولی بھالی بچیاں کیا چیز ہیں، اس نے
بچی کو بلا کر اپنے سینہ سے لگایا اور آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔

فروری سنہ ۲۳ء

کلنگ کا ٹیکا

دسمبر ۱۹۲۵ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری قبلہ نے حقوق نسوان پر ایک نہایت درد انگیز تقریر فرمائی تھی، اسکا یہ حصہ جس میں مسلمان لڑکیوں کے حق وراثت سے محروم ہونے پر آنسو گرائے گئے تھے اس قدر پر تاثیر ہے کہ ہزاروں آدمی زار و قطار رو رہے تھے۔ اور سر محمد شفیع اور سر عبدالقادر جیسے مقتدر مسلمانوں نے اس کلنگ کے ٹیکے کو اچھی طرح محسوس فرما کر پنجاب کے ماتھے سے دور کرنے کی کوشش فرمانیکا وعدہ کیا تھا "

گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں جب کائنات کی ہر شے قانون قدرت کے تحت میں ترقی و تنزل سے متغیر ہوئی، ننھے ننھے بیج سرسبز و شاداب پودوں کا لباس پہن کر اور دنیا کو اپنی بہار دکھا کر بہت سے دماغوں کو معطر کرنے کے بعد فنا ہو گئے چھوٹے چھوٹے پودے تناور بارآور درخت بنے اور وہ سرزمین جہاں ہو کا عالم اور سنسان میدان تھا۔ گلزار ہو گئی خود میرے سیاہ بھنور بال بگلہ کا پر ہوئے۔ مگر حقوق نسوان کے سلسلہ میں میرے وہ آنسو جو آج سے قریبًا تہائی صدی پیشتر صالحہ[1] اور سارہ[2] کے اوراق پر گرے تھے آج بدستور بہ رہے ہیں۔ میرے اعضائے جسمانی رو بہ انحطاط ہوئے، جوانی بڑھاپے سے بدل گئی، جوش اور امنگیں ختم ہوئیں مگر یہ آنسو ختم نہ ہوئے، ختم ہونا تو درکنار کم بھی نہ ہوئے، کم ہونا کس کا اور بڑھے اور اتنے بڑھے کہ بڑھتے بڑھتے ناسور ہو گئے لیکن

"کوئی ایسی سکھی چاترنہ ملی جو پی کا دوار بتادیتی"

کوئی ایسا مسلمان میسر نہ آیا جو ان زخموں پر مرہم رکھتا، مرہم تو درکنار نمک چھڑکا، پہلے بھی چھڑکا اور آج بھی چھڑکا جا رہا ہے، مگر میں اس وقت بھی ممنون تھا اور آج بھی شکر گذار ہوں۔

---

[1] حیات صالحہ [2] منازل السائرہ　علامہ محترم کی پہلی دو تصانیف ۱۲

نہ معلوم خوش قسمتی ہے یا بدنصیبی کہ میں اس وقت اس سرزمین میں کھڑا ہوں، جس نے دختران اسلام کے حقوق پامال کرنے میں ملک کے ہر حصہ کو مات کیا، میرا روئے سخن پنجاب کے ان مسلمانوں کی طرف ہے جن کی سرکش گردنیں خدائے برتر کے حضور میں نہ جھکیں، انہوں نے رواج کو غالب قرار دیکر لڑکیوں کو ترکہ پدری سے محروم کیا، ان کے اکڑے ہوئے سر تنی ہوئی گردنیں اور نخوت سے بھرے ہوئے سینے، خدائے بہتر و برتر کے حضور میں اسوقت تک نہ جھکے جبتک کہ خدائے واحد کے ارشاد کے موافق الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر موت نے ان کو گہری گور میں سلا دیا۔ وہ ہماری ظاہری آنکھوں سے پنہاں ہوگئے مگر ان کے اعمال یعنی فیصلہ خداوندی کی مخالفت اور بے زبان لڑکیوں پر وہ مظالم جو ترکہ پدری سے محروم کرنے میں انہوں نے توڑے اُن کی زندگی کی مستقل یادگار موجود ہیں اور جب تک یہ شاہراہ جو انہوں نے قائم کی ہمارے سامنے ہے اور اس پر چلنے والا ایک شخص بھی موجود ہے مسلمان آنکھیں ان کے رحم کو فراموش نہیں کر سکتیں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر میں مسلمانوں کو اس حدیث کی طرف متوجہ کردوں جس میں مخبر صادق نے یہ خبر دی ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں میں اچھے تھے بعد الموت خدا کے نزدیک بھی اچھے ہیں اور جن کے بعد مسلمان ان کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتے وہ خدا کے نزدیک بھی اچھے نہیں ہیں :-

عزیزو! عورت کی یہ فطرت کس قدر قابل رحم ہے کہ مرد کی ایک نگاہ محبت اس کے دل سے تمام شکوے شکایت رفع کردیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سی لڑکیاں جو ان مظالم کا شکار ہوئیں یہ گوارا بھی نہ کریں گی کہ ان کا ذکر اس طرح رو یا جائے، اور ان کے شفیق باپوں کا کچا چٹھا ان الفاظ میں کھولا جائے مگر دنیا کا کوئی قانون مظلوم کی خاموشی پر ظالم کے حکم کو نظر انداز نہیں کرسکتا لڑکوں

لڑکیوں کی پرورش میں مسلمان جو امتیاز کر رہے ہیں اس پر مجھے مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ ہر باپ خود اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں پر کیا صرف کر رہا ہے، مگر کیا وہ ازراہ کرم کبھی اس پر بھی غور کرے گا کہ جب بیماری کی حالت میں وہ پلنگ پر پڑ جاتا ہے اور شام کے وقت ڈاکٹر کے ہاں سے دوا لانے کی ضرورت ہوتی ہے تو جس لڑکے پر بھر بھر مٹھی روپیہ صرف کرتا ہے۔ صرف اسلئے کہ ٹینس یا کسی دوسرے کھیل کا وقت ہے، اس کی تیوری پر بل آجاتا ہے وہ جاتا بھی ہے دوا بھی لاتا ہے۔ مگر مجبور ہو کر با دل ناخواستہ شام کے وقت جب مرض کا غلبہ ہوتا ہے اور بخار کی شدت اسے بے خبر کر دیتی ہے۔ اس وقت وہ ننھے ننھے ہاتھ اس کے درد سر کا مقابلہ کرتے ہیں، اس کے پریشان بالوں کو درست کرتے ہیں، اس کے پژمردہ رخساروں سے کھیلتے ہیں اور اپنی بساط کے موافق تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے سے ہاتھ اسی معصوم بچی کے ہیں جو بڑی ہو کر اس سنگدل باپ کے ترکہ سے محروم ہوگی اور اسکا وارث وہ ہوگا جس نے دوا تک کے لانے میں تامل کیا ہو۔!!

مجھے معلوم ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ ہر مذہبی حکم کو عقل کی ترازو اور فلسفہ کی کسوٹی پر تولتے اور پرکھتے ہیں۔ اسلئے مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ حقوق نسواں کے سلسلہ میں میری زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقل سلیم متفق نہ ہو۔

وہ باپ جو اپنی بچی کو اسکے تمام حقوق سے محروم کرتا ہے کسی بچی کو اُس کو جسے دنیا میں لانے کا وہ سبب ہوا ہے اور اس کی پندرہ بیس برس کی خدمات کا معاوضہ ایک ماما کی تنخواہ دس پندرہ روپے ماہوار کے حساب سے تین چار ہزار کے جہیز پر ختم کر دیتا ہے۔ یقیناً حق نہیں رکھتا کہ شوہر کی بدسلوکی کا شکوہ زبان پر لائے، جس باپ کی گود میں پلی اور بڑھی جس گھر میں چھوٹی سے بڑی ہوئی جس کی خدمت میں

رات دن حاضر رہی۔ جس کے آرام و آسائش پر اپنی راحت و مسرت قربان کی، جہاں قدرت نے اس سرسبز و شاداب پودے کو پروان چڑھایا اور یہ خوشنما پھول اس قابل ہوا کہ اپنی شمیم انگیزیوں سے دوسروں کو معطر کر سکے، وہاں باغبان نے اس کی یہ قدر کی کہ اس کی پنکھڑیاں نوچ کھسوٹ کر چمن سے نکالا! اب اگر اس کا شوہر ادائگی حقوق سے قاصر ہے اور اس کی وہ قدر نہیں کرتا جس کی وہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مستحق تھی تو باپ کا جس نے خود ہی ترکۂ پدری سے محروم کیا، کیا منہ ہے کہ شوہر کی بدسلوکی کو زبان پر لائے۔ یہ میں وہ کہہ رہا ہوں جو ایک پولس سب انسپکٹر کو مسلمانوں کے مجمع میں سننا پڑا۔

قبل از اسلام لڑکیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا میں سمجھتا ہوں وہ بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زندہ دفن کردی جاتی تھیں۔ مگر وہ موت اس زندگی سے بہتر ہے۔ جس میں زندگی کا مزہ آجائے۔

حضرت عاصمؓ کا بیان ہے کہ میں نے قبل از اسلام تین زندہ لڑکیوں کو ان ہاتھوں سے دفن کیا۔ تیسری لڑکی کے دفن کی کیفیت وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

کہ میں پردیس گیا ہوا تھا، یہ بچی میرے پیچھے پیدا ہوئی تین سال کے بعد جب میں واپس آیا تو بچی خاصی سیانی تھی۔ میں نے دوسرے ہی روز اس کے دفن کا قصد کیا اور اس کی ماں سے کہا کہ وہ بچی کو دفن کے واسطے تیار کردے۔ ماستا کی ماری ماں میرے قدموں میں گر پڑی اور اسکی پیاری پیاری اور میٹھی میٹھی باتیں یاد دلا کر مجھ سے التجا کی کہ میں اس قصد سے باز آؤں مگر میں نے تمام گریہ و زاری و منت سماجت ٹھکرادی اور حکم دیا دوپہر سے پہلے وہ بچی کو تیار کر دے، بدنصیب ماں نے جس کی آنکھوں سے رات بھر آنسوؤں کا دریا بہا اور انتہائی صدمہ نے جس کو گم کردیا تھا یہ سمجھ کر کہ کلیجہ کا ٹکڑا ہمیشہ ہمیشہ کو چھوٹتا ہے اور پیاری بچی زندہ دفن ہوتی ہے، اس حد تک [illegible]

بچّی کو دلہن بنایا، نہلا دھلا کر اس کے کپڑے بدلے جب وہ وقت آیا کہ میں دفن کے واسطے اس بچّی کو لوں تو ماں کی خاموش آنکھوں نے جس میں التجا کوٹ کوٹ کر بھری تھی، پھر میرے خونخوار چہرے کی طرف دیکھا مگر جب میری ظالم آنکھوں نے اس کی تمام توقعات پر پانی پھیر دیا تو اس نے اپنی بچی میری گود میں دی اور ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑی یہ سب کچھ ہوا۔ مگر میرا پتھر دل نہ پسیجا۔ بچی نے میری گود میں آتے ہی اپنے ننھے ننھے ہاتھ میرے گلے میں ڈال دیئے۔ لیکن اس کی بھولی باتیں دلربا حرکتیں اور موہنی صورت مجھ پر مطلق اثر نہ کر سکی اور میں اس کو لے کر چلا۔ گڑھا کھودا اور جب اس تین برس کی جان کو دفن کی غرض سے اُٹھایا تو وہ خاک جو میرے چہرے پر پڑی تھی، اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں اور قمیص کے دامن سے پونچھی۔ مگر میرے واسطے ہر چیز بیکار تھی میں وہ شفیق القلب باپ ہوں کہ انہیں ظالم ہاتھوں سے اس زندہ بچی کو زمین کا پیوند کیا اور اس پھول کو خاک میں ملا دیا۔"

میرا خیال ہے کہ یہ سلوک بھی جو قبل از اسلام لڑکیوں کے ساتھ کیا جا رہا تھا ایسا ہی تھا جیسا کہ آج کل کیا جا رہا ہے۔ پنجاب کو خدا نے اس وقت اتنی طاقت دی ہے کہ اگر مسلمان اپنی متفقہ قوت سے کام لیں تو وہ گورنمنٹ کا رُخ بدل سکتے ہیں یہ قانون و رواج تو اُن کے اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں پنجاب ہر شعبہ میں بہت کچھ ترقی کر رہا ہے مگر لڑکیوں کو ترکہ پدری سے محروم کرنے میں جو کلنگ کا ٹیکا پنجاب کے ماتھے پر لگا ہوا ہے وہ کسی طرح دور نہیں ہو سکتا۔ اور اشد ضرورت ہے کہ پنجاب اس طرف توجہ کرے۔

دسمبر ۲۵ء

بیوی کی صحنک پر بیوہ لڑکی

سادات محمد پور کی لڑکیاں کچھ شک نہیں آن پر جان دینے والی نکلیں۔ انہوں نے خاندان کی لاج اور باپ دادا کی عزت مرتے دم تک رکھی دو دو دن کی بیاہیاں گھونگھٹ میں رانڈ ہوئیں مگر دوسرے مرد کا منہ نہ دیکھا۔ بچیاں جوان ہو کر بڑھیا اور جوانیں قبر کی گڑیا بن گئیں۔ مگر وہ آن جان کے ساتھ رہی گھونگھٹ قبروں میں کھلے اور میٹھی نیندیں مر کر آئیں، لیکن زندگی میں تیوری پر بل نہ آیا۔ رہیں تو بے کل چلیں تو جل کر غرض زندگی کی کوئی بہار دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ محمد پور والے گورے ہوں یا کالے سید تھے یا پٹھان مگر اس معاملہ میں بے ایمان تھے وہ اپنے ستم پر جس قدر ناز کریں کم، انہوں نے دنیا بھر کے مزے اڑاتے دن دہاڑے رنڈیاں نچائیں۔ کھلم کھلا سوکنیں لائے سنت نبوی کا ادا کرنا فرض ایک چھوڑ چار چار نکاح مگر فرض کا ادا کرنا گناہ ظالم انسانی صورت میں حیوان تھے۔ اپنی زندگی دن عید رات شب برات اور بہن بیٹیوں کی مٹی وہ پلید کی کہ الٰہی توبہ معصوم بچیاں ترکوں سے محروم ہوئیں چاند سے چہرے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماند ہوئے مگر ان سنگدلوں کا دل نہ پسیجا۔

تاریخ محمد پور بلقیس زمانی بیگم کا نام فراموش نہیں کر سکتی یہ عصمت کی بدنصیب دیوی آج بھی ان بیویوں کی سرتاج ہے جو اس

خاک سے اُٹھیں۔ بلقیس رئیس شہر کی حقیقی بھانجی اور باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جس کی شادی میں ڈیڑھ سو ہاتھیوں کی قطار برات کے ساتھ تھی۔ ایک محمد پور کیا آس پاس کے سینکڑوں رئیس سیدانی کی پالکی کے ہمرکاب تھے۔ گرمی کے دن پرانے زمانے کے دولھا بدھی اور سہرے رسمیں اور پھیرے کامل سات گھنٹے جکڑے ہی جکڑے گذر گئے، طبیعت تو اسی وقت بگڑ چلی تھی مگر صبح کے وقت ادھر کھائی بریانی اُدھر سے پیا غٹ غٹ پانی باغ میں ٹہل رہا تھا کہ زور شور سے استفراق ہوا، کہاں کی شادی۔ اور کس کا نکاح ایک دو گھنٹہ میں موت نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔

ماں باپ پر جو ستم ٹوٹا وہ کم نہیں، بھائیوں پر جو مصیبت آئی وہ بجا، عزیز و اقارب جس قدر روئے درست مگر سب سے بڑا غم سیدانی بدنصیب کا تھا، جو ایک رات کی بیاہی دل کھول کر بات بھی نہ کرنے پائی اور رانڈ ہو گئی۔ چودہ برس کی لڑکی بچہ نہ تھی کہ جانتی نہ ہو۔ سمجھتی تھی جانتی تھی۔ دیکھتی تھی اور پہچانتی تھی کہ اب بقیہ زندگی موت سے بدتر ہے، رنڈاپا ان ہی آنکھوں میں بسر کرنا اور عمر اسی دہلیز پر ختم کرنی ہے مگر کہتی کس سے اور کرتی کیا حکم نہ تھا کہ علی الصباح وہ منحوس کسی بڈھے پھوس کو بھی اپنی صورت دکھا سکے، اجازت نہ تھی کہ بیاہ برات میں وہ کسی دولہن کو ہاتھ لگائے، پھول پھلیل عطر اور رنگ اس کے واسطے حرام، مہینوں سر گوندھنا قسم اور برسوں کاجل سرمہ گناہ تھا۔

ایک سال اسی طرح گذرا اور بلقیس ایک بچہ کی ماں تھی، پاؤں

پھیر نے بیس بچیس روز کے واسطے میکے آئی، ماں باپ دونو زندہ تھے۔ بیوہ بیٹی، اور یتیم نواسے کو سر آنکھوں پر رکھا، مشکل سے دو دن دکھیاری کو گذرے ہونگے کہ سسرال سے سواری آ پہنچی کس کی مجال تھی کہ سسرال کا حکم ٹال دیتا۔ بچہ کو لے روانہ ہوگئی، وہی طعنے تشنیع وہی نفرت وحقارت جس لڑکی پر دو ڈھائی سال میں دنیا بھر کے ستم ٹوٹ گئے ہوں۔ اسی کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ کیا گذری ہو بلقیس کا بچہ فیروز تین سال سترہ روز کا تھا کہ بیوہ کی جو کچھ تسکین ماں باپ کے کرم کی تھی وہ بھی ختم ہوئی، دونوں میاں بیوی تین مہینے کے اندر ایک ایک کرکے رخصت ہوئے قانون محمد پور کے موافق بیوہ ماباپ کے مال میں حصہ دار نہ تھی،

دشمن کو بھی خدا یہ وقت نہ دکھائے۔ جو باپ چار ساڑھے چار لاکھ کی جائداد چھوڑ کر مرا اس کی اکلوتی بیٹی ایک کٹر ساس کی دست نگر تھی، یوں تو تمام محمد پور میں بیوہ کی زندگی کتے سے بدتر تھی، مگر بلقیس بدنصیب کی حالت سب سے خراب تھی وہ آدم خور نہ صرف شوہر کو ہضم کرگئی تھی، بلکہ اس کی طرف سے ہر وقت اندیشہ تھا کہ عنقریب اور ایک آدھ کو چٹ کرنیوالی ہے۔ مانا کہ وہ بدبخت حیوان تھی ظالم تھی بے ایمان تھی۔ مگر فیروز سر بدلے کا سر۔ موئے باپ کی مٹی جوان شیر کی نشانی اور دادا دادی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں۔ چار برس کا بچہ وہ غضب کی باتیں ڈھاتا کہ سننے والے منہ چوم لیتے ایک مینا تھی کہ چاروں طرف ملکاتی تھی، ایک کھلونا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل فتح کررہا تھا۔ مگر شاباش ان دادی پھوپی کو جو پیار کرنا تو درکنار منحوس ماں کے بچے سے سیدھے

منہ بات تک نہ کرتے۔

محلسرا ئے کا جنوبی حصہ جو زیادہ تر سنسان تھا، ان دو ماں بیٹوں کا مسکن یا بیوہ کا نشیمن تھا آگے بڑھ کر ماماؤں کے مکان تھے۔ جو اپنے کام سے فراغت پا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو آ بیٹھتی تھیں۔ دونوں وقت معمولی کھانا آجاتا اور ماں بیٹے خدا کا شکر کر کے کھا لیتے۔ جب کوئی خاص ضرورت زیادہ مجبور کرتی تو پندرہویں بیسویں روز ڈرتے ڈراتے ساس کی خدمت میں حاضر ہو جاتی۔ اور چپکی چلی آتی ؎

مرزا پور کی کجری کی طرح محمد پور کی بجری آج تک مشہور ہے۔ برسات کے موسم میں ساون کی چودہ تاریخ کو ہر گھر میں جھولے پڑتے ہیں۔ اور خاندان بھر کی بہو بیٹیاں ایک جگہ جمع ہو کر جھولتیں ملہار گاتیں اور خوشیاں مناتی ہیں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس جلسہ کی باری بلقیس کی ساس کے ہاں آئی۔ گنگا جمنی کھم گاڑے گئے۔ سوت ریشم کے رسے اور رنگ برنگ کے جوڑے بھاری بھاری زیور پہن اوڑھ آموجود ہوئیں ما کڑاہیاں چڑھیں۔ سہال پڑے، اندھیری چھائی ہوئی تھی اور اودی گھٹا مشرق سے اٹھ رہی تھی، سہاگنوں کی بھنبیری آوازیں ہوا میں دور دور گونج رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا اور ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ بھول گئیں یا گمراہن تھا۔ آج صبح سے ساس نے منوں کھانا تقسیم کیا۔ مگر تقدیر میں دو دانے نہ تھے تو ان دو روحوں، بلقیس اور فیروز کے، بچہ چھ برس کی جان بساط ہی کیا، شام تک تو ماں پھسلاتی پھسلاتی لئے بیٹھی رہی۔ مگر عین وقت پر آنکھ بچا نکل کھڑا ہوا، مامتا کی ماری ماں بھی پیچھے پیچھے لپکی کہ بن باپ کا بچہ بے وارثی بیوی کی ناک نہ کٹوا دے، دونوں ماں بیٹے دو چار ہی قدم

کے فرق سے محل سرائے میں داخل ہوئے، بیسیوں عورتیں بھری ہوئی تھیں بچہ ایک کونہ میں جا کر کھڑا ہو گیا، ماں نے بہتیرا سمجھایا ڈرایا مگر وہ کسی طرح نہ چلا۔

بلقیس کی پھوپی زاد بہن افروز ساس کی حقیقی بھانج بہو بہن کی صورت دیکھتے ہی تڑپ گئی، روشن خیال پڑھی لکھی بھولا چھوڑ رسم توڑ بہن سے جا لپٹی، جہاں بیوہ کا سہاگن کو ہاتھ لگانا گناہ اور جلسہ میں شرکت حرام تھی وہاں اتنی بڑی بدعت، ایک آسمانی آفت تھی جس کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔

بیوی کی صحنک اندر کے کمرے میں چنی ہوئی تیار تھی بیویاں اندر جا کر بیٹھیں اور فیروز بیگم کو آواز دی۔

افروز:۔ "چلو بلقیس بیگم اندر چلیں۔"

بلقیس:۔ "اے ہے آپا میرے یہاں آتے ہی یہ سب کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ میں تو اس وقت بچہ کی لگی میں چلی آئی۔"

افروز:۔ "تم میرے ساتھ چل کر بیٹھو میں دیکھ لوں گی، ان میں سے کون تم سے آنکھ ملاتا ہے۔ ممانی جان (ساس) بزرگ ہیں تو ہوں اس معاملہ میں ان سے بھی سلجھ لوں گی۔"

بلقیس:۔ "نہیں آپا جان خدا کے لئے نہیں، جب جانے لگو گی تو مجھ سے ملتی جانا، اب میں جاتی ہوں۔"

بلقیس کی صورت سے بیوگی کپڑوں سے افلاس حالت سے مصیبت ظاہر ہو رہی تھی، جب افروز نے ہاتھ نہ چھوڑا اور زیادہ اصرار کیا تو کہنے لگی،،

"میرے کپڑے اس لائق نہیں کہ میں ان سب کے ساتھ
بیٹھ سکوں، میری صورت اس قابل نہیں کہ میں اب
سب کو دکھا سکوں۔ میں اگر چلی بھی گئی تو ایک تو سب
بیویاں دسترخوان سے اُٹھ جائیں گی، دوسرے اگر میں
نے کچھ کھایا بھی تو آپا افروز میرے حلق سے نہ اترے گا"

یہاں تک پہونچکر بلقیس کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے مگر اس نے ضبط کیا، منہ پھیر کر ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور بچہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا :-

"چلو بیٹے گھر چلیں"

افروز بہن کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی، اتنا سنتے ہی بے اختیار ہو گئی گلے میں باہیں ڈال دیں، جھک کر پیار کیا اور کہا :-

"بتا تو سہی کیا بپتا پڑی"

دل پہلے ہی زہیر ہو رہا تھا، افروز کی تسکین نے برسوں کی دبی ہوئی آگ میں شتابہ لگا دیا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، افروز بہن کا یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گئی، کوٹھے پر لے جاکر مفصّل حال سنا، اسوقت بلقیس مصیبت کی ایک ایسی تصویر تھی، جس کو دیکھ کر کلیجہ کٹتا تھا جب بلقیس نے یہ الفاظ کہے ہیں :-

"آپا یہ معصوم بچہ ان کا کوئی نہ ہو، مگر میرے کلیجہ کا ٹکڑا ہے چوبیس گھنٹے ہوئے کہ کھیل کا دانہ تک اڑ کر اس کے حلق میں نہیں گیا" تو افروز بہن کی حالت پر اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی، وہ گری پڑی نہ تھی محمد پور کا ایک رئیس اس کی چوٹی کا نہ تھا، بلقیس کے خسر جیسے دس کو مول لے کے

افروز۔ "مومانی جان افسوس صد افسوس ہے آپ کے مذہب اور
عقیدے پر! اسلام دنیا میں اس غرض سے آیا تھا کہ وہ پردۂ دنیا
سے شرک کو غارت کرے اور چاروں طرف توحید کا ڈنکا بجا دے
آپ مسلمان ہو کر اتنی مشرک کہ بیوہ کا ہاتھ سہاگن کو نہ لگے۔ کیا اس کو
رانڈ کر دینے والا خدا نہیں ہے۔ جو آپ کا ہے، کیا بد نصیب بیوہ
میں کوئی ایسی طاقت بھی ہوتی ہے جو مجھ میں اور آپ میں نہیں ہے!
کلام اللہ ہم کو یہ حکم دیتا ہے۔ کہ اپنی رانڈوں کے نکاح کر دو۔ اور ہم
ان معصوم دلہنوں کو اس طرح رکھیں کہ تڑپنے تک کی اجازت نہ ہو۔
کیا حضور اکرم کی پہلی بیوی خدیجۃ الکبریٰ جن سے وہ چاند پیدا ہوا جس نے تمام دنیا کو جگمگا دیا جس کے
وجود سے سادات کا سلسلہ شروع ہوا سہاگن تھیں؟ کیا پیغمبر زادیاں رانڈیں مر گئیں؟ کیا حضور
نے بھی رحمت پر ہماری جان صدقے، ہماری طرح بیوہ سے نفرت کی؟ ممانی جان افسوس
ہے ہماری زندگی پر ہماری حالت پر اور ہمارے عقیدے پر۔

یہ صحنک کس بیوی کے نام کی تھی وہ پاک بی بی جس نے تمام عمر
چکی پیسی جو دنیا میں پہلی سیدانی تھی؟ آپ نے اس صحنک سے
ایک سیدانی کو حقارت سے اٹھا دیا۔ لیکن اس صحنک پر شریک
ہونے کی حقیقی مستحق یہی سیدانی تھی ممانی جان آپ نے غضب
کیا آپ نے ایک مظلوم سیدانی کا دل توڑ دیا اور خدا کا مطلق خوف
نہ کیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس تحریر کو منظور فرما کر [illegible]
آپ کی نہیں سادات محمد پور کی [illegible]
کرتی ہوں۔ اچھی میری مومانی جان [illegible]
کوشش میں کامیاب ہو۔

پائیں باغ کے چند لمحے کے جانے میں نہ معلوم کیا راز تھا کہ دفعتہً افروز نے ماما کی طرف دیکھا، فیروز اس کی گود میں دولھا بنا موجود تھا، ماما دم بھر کو باہر گئی، اور انگریزی باجوں کی آواز کانوں میں آنے لگی، افروز اس وقت بلقیس کو لے کر غسل خانہ میں گئی۔ اپنے ہاتھ سے نہلایا اور جس جسم پر پیوندوں کے چکٹ کپڑے تھے اب وہ زرق برق پوشاک سے آراستہ تھا، مجلس نکاح تیار تھی، ایجاب و قبول کے بعد افروز نے بآواز بلند کہا "مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو ممانی جان معاف فرمایئے بلقیس جہاں بیگم اب تک میری بہن تھیں، لیکن آج سے وہ میرے چھوٹے بھائی کی دلہن اور میری حقیقی بھاوج ہیں۔"

پالکی تیار تھی۔ بلقیس جہاں بیگم دلہن بنی سوار ہوئیں۔ اور سسرال روانہ ہوگئیں

سنہ ۱۵ء

رواج کی بھینٹ

کٹر اور اتنی پتھر ملی کہ منت نئے ظلم توڑواتی اور پھر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوتا۔

مسلمانوں کے نکاح ثانی کو دیت والہانہ سمجھ کر نکاح ہم ترین سمجھتے تھے نکاح کو جائز نہ کہیں گے، اگر مجبوری و معذوری سے تسلیم کرتی نہیں تو ضرورت تھی کہ حسن احکام اسلام کے بموجب مساوات کا ایسا سرمہ لگا کر دونوں کو دیکھتا کہ عطیہ کی آنکھیں ملال کا میل تک نہ آتا لیکن یہ کیا غضب تھا کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں بیمار عطیہ دودھ پیتے بچہ کو کلیجہ سے لگائے میاں اور سوکن کے لئے چائے بنائے اور ٹمٹے تلے۔

(۳)

ایک شوہر اور تنبیہ دلڑکی کی جو ذہنیت ہوگی ان حالات سے ہونی چاہیئے تھی وہی عطیہ کی ہوئی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ حسن کی جن آنکھوں سے محبت کے چشمے پھوٹ رہے تھے اب ان سے زہر ٹپک رہا تھا، ایسے وقت نہ گزری ایک رات کا ذکر ہے مینہ برس کر تھم چکا تھا آسمان اپنے چہرے سے سیاہی کا پردہ آہستہ آہستہ سرکا رہا تھا اور صبح صادق خراماں خراماں منزل دنیا تک بڑھ رہی تھی، ادھر خانہ خدا کی طرف سے وداع شب کا اعلان ہوا۔ ادھر بیمار عطیہ شوہر اور سوکن کے ناشتہ کی تیاری میں مصروف ہوئی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے تیر کی طرح کلیجہ میں لگ رہے تھے گلے میں پرانی روئی کی کمری سر پر معمولی چادرہ پورا ہوا نے ہڈیوں تک اور سے کپکپا دیئے اس غضب کا درد اٹھا کہ بیقرار ہو گئی۔ بہتیرا سنبھلی نہ سنبھالا گیا اٹھی بیٹھی لیٹی پڑی مگر سب بے سود تھا۔

حسن کو اگر عطیہ سے ہمدردی نہ تھی تو اس کی خوشی مگر اس خم پر

کچھ کے بے ایمان کی بدگمانی تھی کہ بیماری کو بہانہ درد کو مکر اور تکلیف کو فریب سمجھا۔ دولھا دولہن اٹھے چولھا ٹھنڈا پڑا تھا دونوں آگ بگولا ہو گئے اور میں دولہن نے کہا :-

"تم نے اپنے ساتھ میری مٹی بھی پلید کر رکھی ہے، بھلا یہ وقت ناشتہ کا ہے ابھی آگ بھی نہیں سلگی ایلا سے اس جی کے جلانے سے تو ہاتھ کا جلانا بہتر کل سے میں خود کر لیا کروں گی ان کو تو چکر آرہے ہوں گے"!

کریلا اور نیم چڑھا، حسن پہلے ہی غصہ کو شیر کی نظروں سے گھور رہا تھا بیوی کے اس فقرے نے غصّہ کی آگ اور بھڑکائی، جھوٹی فریبن، دغاباز، بدمعاش، کام چور، مریل، سست، ایک لفظ ہو تو کہا جائے۔

" اٹھ کھڑی ہو مکار ، ابھی آگ سلگا، نہیں تو مارے تھپڑوں کے منہ پھیر دوں گا"

حسن یہ کہتا ہوا سانپ کی طرح پھنپھناتا اُٹھا، اور عطیہ کو مارنے چلا کہ دروازہ سے خسر کی آواز آئی یہ عطیہ کا باپ تھا جو معمولی گرا پڑا آدمی نہیں شہر کا مشہور وکیل تھا، اکلوتی بچی کی بیماری نے اس کی جان پر بنا دی تھی حسن بیوی پر شیر تھا، مگر خسر کے سامنے بھیگی بلی بن گیا اور دلہن کو ہٹا کر اس کو اندر لایا حسن جس وقت بپھرتا عطیہ کی طرف چلا اور اس کو یقین ہو گیا اس وقت وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی، اس نے ایک خاموش نظر شوہر کے چہرہ پر ڈالی زبان چپ تھی مگر نگاہ باواز بلند کہہ رہی تھی کہ میں بے گناہ ہوں، باپ کی آمد نے شوہر کی مار سے بظاہر چھڑا دیا مگر حق یہ ہے کہ جس نے مارنے کا قصد کیا اس نے مار ہی لیا اس وقت عطیہ کے

قلب کی کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ صرف شوہر والی بیبیوں کا دل کر سکتا ہے اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں وہ باپ کے آنے سے بھی خوش نہ ہوئی اور چاہتی کہ اس عمر بھر کے رفیق اور ابدی دوست کے ہاتھوں گھٹ گھٹ کر اور اس کے سامنے مرجاؤں...

باپ کو آتا دیکھکر اس نے ڈوپٹہ سے آنسو پونچھے سنبھل کر بیٹھی سلام کیا ہرچند باپ نے پوچھا مگر اس نے یہی کہا کہ "خدا کا شکر ہے اچھی ہوں" وردلحہ بہ لحہ تیز ہورہا تھا۔ بخار شدت سے چڑھ رہا تھا، باپ کی کسی بات کا جواب نہ دیتی تھی آخر اس نے ہاتھ سے دیکھا بدن جھلس رہا تھا کہا "تم تیار ہو میں ڈولی لاتا ہوں چلو اپنے ہاں چلو"

جوان لڑکی کی معصوم نظروں نے اس کے جواب میں باپ کی صورت دیکھی گو اس کی زبان کچھ نہ کہتی تھی، مگر حالت نے یہ جواب دیا کہ میں اب تو آپ کی ملکیت نہیں مجھکو آپ نے ایک دوسرے شخص کے قبضہ میں دیدیا وہی میرا مالک حاکم اور سرتاج ہے۔

بڈھا باپ تجربہ کار آدمی تھا سمجھ گیا کہ شوہر کی اجازت کے بغیر چلنا منظور نہیں۔ داماد کو بلاکر کہا "میاں اجازت دو تو چار روز کے واسطے اپنے ہاں لے جاؤں"۔

حسن۔ "مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے نہایت خوشی سے"۔

اتنا کہہ کر حسن نئی دلہن کے کمرہ میں گیا اور باپ ڈولی لینے۔ حسن باہر نکلا تو عطیہ نے آہستہ سے کہا کیا واقعی تم اجازت دیتے ہو کہ میں چند روز کے واسطے چلی جاؤں"۔

حسن۔ ایک دفعہ تو کہہ دیا اور کس طرح کہوں۔

عطیہ "التجا یہ ہے کہ اگر روز انہ نہیں تو دوسرے روز چند لمحے کے واسطے اپنی صورت دکھا دیا کرو۔"

حسن "میں خالی بیٹھا ہوں تاکہ روز حاضر ہوا کروں ! !"

ڈولی آگئی عطیہ بچہ کو گود میں اٹھانا چاہتی تھی کہ حسن نے نئی دلہن کے مشورہ سے کہا "بچہ کو چھوڑ جاؤ میں پہنچا دوں گا" ادھر باپ کا تقاضا ادھر مامتا کا جوش منت سے کہا سماجت سے کہا مگر سنگ دل نے بچہ کی اجازت نہ دی باپ نے اندر آکر کہا "میاں کیا کہتے ہو۔"

حسن "آپ ان کو لیجائیں میں ڈاکٹر کو دکھا کر خود ہی بچہ کو پہونچا دوں گا۔"

باپ چھچھورا نہ تھا کہ لڑنے لگتا خاموش ہو گیا اور ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بیٹی کو ڈولی میں بٹھا گھر کا راستہ لیا۔

آفتاب لاتعداد مرتبہ طلوع ہو کر غروب ہوا چاند بلشمار بار چمک کر ماند پڑا مگر وہ آفتاب جو بچہ کی مفارقت میں ڈھلا اور ڈوبا بدنصیب عطیہ کیواسطے میکے میں ایسا درد چھوڑ گیا جس کی ٹیسوں اور چمکوں نے مردہ کر دیا میکے کی ماما حقیقی چچا رشتے کے ماموں سب ہی گئے اور کوشش کی مگر حسن نے بچہ نہ بھیجا' دکھیاری کلیجہ پر گھونسے مارنے لگی دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی اور کوئی اتنا نہ تھا کہ چار پہر بچھڑے ہوئے بچہ کی صورت دکھا دے تڑپ رہی تھی کہ حسن کا یہ پیغام آپہونچا۔

بچہ اپنی پھوپی کے پاس گاؤں میں ہے لیکن تم ابھی آجاؤ اگر فوراً نہ آئیں تو صبح ہی زوجیت کا دعوٰی دائر کر دوں گا اور عدالت کا حکم لے کے چوٹی پکڑ کر گھر میں سے گھسیٹ لاؤں گا۔

عطیہ کے باپ نے یہ الفاظ سُنے بیٹی کو بلا کر گلے سے لگایا اور کہا

"جا خدا کے سُپرد کیا"
اتنا کہہ کر بدنصیب باپ کی، ہچکی بندھ گئی۔ اس نے کمرہ میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

عطیہ کی حالت خراب تھی جب یہ سنا کہ بچہ بھی وہاں نہیں ہے اس وقت سے بخار اور تیز ہو گیا تھا خدمت کی مصیبت آنکھ کے سامنے تھی ماں بہنیں، سہیلیاں، بھنیلیاں سب کھڑی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں ڈولی موجود تھی سوار ہونے سے پہلے عطیہ نے کہا:۔

مرض کی حالت مریض سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا ہیں اب اس دنیا میں چند ساعت کی مہمان ہوں اور قریب ہے وہ وقت کہ ماں میری موت اور باپ فراق ابدی پر خون کے آنسو گرائیں اور میری نامراد آنکھیں معصوم بچہ کی صورت کو پھڑکتی ہمیشہ کی نیند سو جائیں۔ مگر مجھے ماں کا صدمہ باپ کے رنج اور عزیزوں کے افسوس سے زیادہ اس مصیبت کا دھڑکا ہے جس کے خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں بہنوں جن کانوں نے بچپنے میں ماں اور باپ کی جھڑکی تک نہ سنی نکاح نے ان کو سخت سے سخت اور بدتر سے بدتر کلمے سنوا دیئے، جس جسم پر پھول کی چھڑی نہ لگی تھی اب اس پر بیدیں پڑنے کا وقت آپہونچا۔

میرا سانس اُکھڑ رہا ہے اور وقت آخر ہے میرا پیام مسلمانوں تک پہنچا دینا بزرگو اگر صداقت اسلام کی روشنی دلوں میں اور انصاف کی جھلک آنکھوں میں موجود ہے تو کبھی بھولے بسرے سوتے جاگتے ان بدنصیب بہنیوں پر بھی غور کرو جو ناز و نعم سے پل کر ہاتھوں چھاؤں بڑھ کر سنگدل شوہروں کے قبضہ میں جا پھنسیں مسلمانو

کی حالت کا قیاس اپنے اوپر نہ کرو اس بدنصیب قوم کی حالت زار کی داستان گھر کی ماماؤں اور پڑوس کی بدنصیبوں سے سُنو، زندگی ان کو مصیبت اور دنیا ان کے واسطے دوزخ ظالم شوہروں نے اُٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات سے ان کو کائنات کی بدترین ہستی بنادیا للہ ایمان سے کام لو اور بتاؤ اگر ہم نے حکم طلاق کے آگے کبھی اُف کی ہو، تم نے بے گناہ بے قصور طلاقیں دیں اور ہم نے گردنیں جھکائیں۔ مگر اسی رسول اور اسی مذہب نے ہم کو خلع کا حق دیا تھا مگر ہے، کوئی مسلمان جو آج کہہ سکے کہ اس نے ایک بدنصیب بیوی کو خلع دلواکر ظالم شوہر سے چھٹکارا دلوا دیا ہو۔

ہم نے خاک عرب سے اُٹھنے والے رسول کے احکام سر اور آنکھوں پر رکھے ہیں اور اسلام کی لاج رکھی، مگر تم نے اس پاک ہستی اور مکمل انسان کا ارشاد ٹھکرا کر بشمار کی جایاں مصیبت پیٹتی اور آفت بھگتی قبروں میں پہنچا دیں اور خلع نہ ہونے دیا۔

عورتوں کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور کوئی ایسی نہ تھی جو اس کی صورت پر لبیک نہ کہہ رہی ہو۔ اب عطیہ کی آواز رُک گئی۔ وہ ڈولی میں بیٹھنا چاہتی تھی کہ کھانسی اُٹھی صرف اتنا کہا:۔

"ہائے میرا بچّہ"

اور وہیں ٹھنڈی ہوگئی۔

سنہ ۱۹ء

سوتیلی ماں کا آخری وقت

جب اشرف جہاں بیگم کو اپنی زندگی سے نا امیدی ہوئی، حکیم جواب دے چکے تو اس آسمانی حور نے جو انسانی صورت لے کر دنیا میں آئی تھی، اپنے تمام عزیزوں کو جمع کیا، جاڑوں کا موسم تھا اور سوتیلے بچے اُسکے تلووں سے آنکھیں مل رہے تھے. بخار کی شدت تھی اور غفلت لحظہ بہ لحظہ ترقی کر رہی تھی آدھی رات کا وقت تھا کہ اشرف جہاں بیگم نے آنکھ کھولی چاروں طرف سے الحمد بسم اللہ ہوئی کسی نے دعائیں دیں کسی نے بلائیں لیں، اُٹھنے کا ارادہ کیا تو اوپر والوں کی جان میں جان آگئی، شوہر نے جو دم بخود کھڑا تھا سہارا لگایا۔ ساس نے گاؤ تکیہ رکھا، اور وہ نیک بی بی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُٹھنے کی تکان سے سانس پھول گیا تھا، تھوڑی دیر بعد جب سانس کچھ ٹھیک ہوا تو پانی مانگا اور لڑکھڑاتی آواز میں زور سے کہا۔

پیاری بہنو! تم سے بعض گو عمر میں مجھ سے بڑی ہوں، مگر رشتہ میں سب چھوٹی ہیں۔ اب کہ میرا آخری وقت ہے ضرورت ہے میں تم سب کے سامنے اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالوں، میری زندگی ان بیویوں کے واسطے جن کی شادی ہو چکی ہے شاید زیادہ مفید نہ ہو۔ مگر ان لڑکیوں کے واسطے جو بیویاں بننے والی ہیں یقیناً ایک نمونہ ہوگی ؎

بیٹیوں! تمہاری طرح ایک دن میں بھی کواری تھی ماباپ کا

سایہ میرے سر پر موجود تھا بے فکری کے دن تھے آزادی کی راتیں خوشی کا وقت تھا، اطمینان کی باتیں مگر جوانی نے اس بے فکری کا خاتمہ کر دیا، شادی کے پیغام آنے شروع ہوئے میں بظاہر خاموش تھی مگر نکاح میری زندگی اور موت کا فیصلہ تھا، تمام گفتگو غور سے سنتی رہی مگر اس لئے کہ محض واقعات پر نتیجہ نکالنا ہوتا تھا، میں امّاں ابّا کی رائے اس واسطے کہ وہ تجربہ کار تھے اپنے سے بہت بہتر سمجھتی تھی، پھر بھی آج جب کہ نو برس سے زیادہ ہوئے ہیں زبان سے نکالتی ہوں کہ اماں جان کے ایک پیغام سے انکار کرنے کا مجھ کو اتنا رنج ہوا کہ میں نے دو وقت روٹی نہیں کھائی، یہ میرے چچازاد بھائی کا پیغام تھا لیکن آخر کار ان کی رائے ٹھیک نکلی ا۔ میرا خیال بالکل غلط نکلا، اس شخص نے پے در پے تین بیویاں کیں اور تینوں کو جلا جلا اور گھلا گھلا کر پار اُتارا۔ جب اماں جان نے اس گھر کو جس میں ہم سب بیٹھے ہیں پسند کیا اور اس بر پر رضامندی ظاہر کی تو مجھ کو سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ ان دونوں کلیجہ کے ٹکڑوں کو جو میرے پاس بیٹھے رو رہے ہیں کہنے کو سوتیلے مگر پیٹ کے بچوں سے زیادہ عاشق زار کس طرح خوش رکھوں گی، یہی دھڑکہ تھا جس کو ساتھ لئے ہیں سسرال میں آ داخل ہوئی۔ سرکار نے جیسا دنیا کے تمام مردوں کا قاعدہ ہے میری صورت دیکھتے ہی بچوں کی وقعت کم کر دی ان کا کھانا پینا پہننا اوڑھنا سب میرے ہاتھ میں تھا

میں خود بچہ تھی اور ان بچوں کی خدمت میرے بس کا کام نہ تھا پھر بھی خوف خدا میرے دل میں تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ دنیا کی کسی حالت کو قیام نہیں۔ زندگی کے ساتھ انقلاب لگے ہوئے ہیں یہ دو معصوم روحیں جو قدرت نے میرے سپرد کی ہیں۔ محض میری شفقت کی محتاج ہیں۔ نہ معلوم چند روز بعد میں اس شفقت کے قابل بھی رہوں یا نہ رہوں، میں اندھی لنگڑی کانڑی رانڈ ہو جاؤں اور بھیک بھی مجھ کو میسّر نہ ہو اسلئے جہاں تک ممکن ہوتا میں ان کی خاطر مدارات کرتی دو سال اسی طرح گذرے اور میں بھی ایک بچہ کی ماں بن گئی، مجھے اب اپنے بچہ کے آگے یہ دونوں زہر معلوم ہوتے اور ہر وقت یہ خواہش ہوتی کہ سرکار کی تمام محبت چاروں طرف سے کھنچکر میری طرف آجائے میری آرزو پوری ہوئی سرکار دم بھر میرے بچہ سلمان کو آنکھ سے اوجھل نہ کرتے اور اپنے بچہ عرفان کو جو مشکل سے تین برس کا ہوگا ہمارے کمرہ تک میں نہ گھسنے دیتے۔ اسی طرح چار برس اور گذر گئے۔ مجھے دن عید اور رات شب برات تھی ان سوتیلے بچوں کا کانٹا قریب قریب نکل چکا تھا۔ یہ زندے مگر مردہ سے بدتر میں بھی اسوقت کچھ ایسے گھمنڈ میں تھی کہ مجھے ان دونوں سے سیدھے منہ بات کرنا قسم میں جو ہاتھ اٹھاکر دیتی یہ لے لیتے، جو کہہ دیتی وہ کر لیتے، عرفان لاکھ بچہ تھا مگر چھ سات برس کا بچہ اپنی حالت اچھی طرح پہچانتا، اور اپنی عزت پوری پوری طرح جانتا، دلت

پھر میرے بچہ کے پیچھے پیچھے خوشامد کرتا پھرتا، پٹنا کٹنا گھڑکیاں سُننا، اور اُف نہ کرتا، مجھ کو خود ایسے لڑکے کی ضرورت تھی، جو ہر وقت سلمان کی خدمت کرتا اس کو بہلائے کھلائے اس کی خدمت کرے، ان داموں عرفان مجھ کو کچھ گراں نہ تھا، سلمان کھانا کھا چکتا تو اس کے آگے کا بچا بچایا کھانا بھی اسی کو دے دیتی، پُرانی دُہرانی جوتی پھٹا پُرانا کرتا بھی اسی کے کام آتا۔ میری سوکن کے زمانہ کا ایک طوطا تھا جس کو سب ہیرا من کہتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے گرمی کے موسم میں شام کے وقت میں نہانے جا رہی تھی۔ سونے کی گھڑی نکال کر میں نے رکھنی چاہی، سلمان میرے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا گھڑی دیکھتے ہی مچل گیا۔ دس بیس روپے کی چیز ہوتی تو خیر ساڑھے تین سو کی گھڑی میں نے اُٹھا صندوقچہ میں چھپادی بچہ مچل گیا، لگا پنخنیاں کھانے عرفان کھڑا اس کو پنکھا جھل رہا تھا، بہلایا چمکارا مگر بچہ کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ اسی سلسلہ میں غریب جا کر طوطے کا پنجرہ اُٹھا لایا اور کہنے لگا۔

"مٹھو میاں پڑھ رہا ہے"

وہ تو ادھر بہلا اور میں غسل خانہ پہونچی ابھی اچھی طرح نہانے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے بلکنے کی آواز میرے کان میں پہونچی۔ کیسا نہانا اور کس کا غسل، جلدی سے تین لوٹے ڈال باہر آئی تو کیا دیکھتی ہوں بچہ کی انگلی سے خون کی تللی بندھی ہوئی ہے اور وہ تڑپ رہا ہے۔ محبت کے مارے بیتاب اور غصہ کے مارے آگ بگولا ہوگئی انا نے کہا کہ موئے عرفان نے طوطے سے انگلی کٹوا دی۔ اتنا

سنتے ہی میں آپے سے باہر ہو گئی۔ میں چلتا تو عرفان کی بوٹیاں کاٹ کر
چیلوں کو دے دیتی۔ بچہ نے ایک حسرت کی بھری ہوئی نگاہ اس پر
ڈالی اس کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ میرے چہرہ
پر تھی اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہی طوطے کا پنجرا جس کی ایک
تیلی ٹوٹی ہوئی تھی، اٹھا کر اس کے منہ پر اس زور سے مارا کہ تیلی
انگل بھر کنپٹی میں گھس گئی اس کے گورے گورے کلّے خون میں
لہو لہان ہو گئے، بن ماں کا بچہ اس وقت مصیبت کی سچی تصویر
تھا بیکسی اس کے چہرے پر برس رہی تھی اور گھونگر والے بال
اس کی بے گناہی کی داد دے رہے تھے۔ اس کی معصوم
آنکھیں آنسوؤں کی جھڑیاں بہا رہی تھیں مگر میرے غصہ کی آگ
کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ جب تک آتا نے انگلی دکھلا کر چپکی
باندھی میں نے اس مصیبت کے مارے کا ہاتھ پکڑ کر دو طمانچے
اور مارے اور پھر ایک ایسا دھکا دیا کہ بے قرار ہو کر در پر
جا کر پڑا اور ستون کی کگر بھوں میں چبھ گئی۔ کنپٹی پہلے ہی لہو لہان
ہو رہی تھی بھوں بھی زخمی ہو گئی، بے بس اور مظلوم عرفان کی وہ
تصویر آج تک میرے دل سے فراموش نہ ہوئی۔ اس کے کپڑے
خون میں شرابور تھے مگر اس کو اپنی تکلیف کا مطلق خیال نہ تھا۔
بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ مارپیٹ کا یقین تھا، اس کی آنکھ
سے آنسو جاری تھے وہ ہاتھ جوڑے ایسی نظر سے مجھ کو
دیکھ رہا تھا جو میرے رحم کی التجا کر رہی تھی ڈر کے مارے آواز
بند تھی اور ایک آٹھ برس کی جان میرے سامنے بیری کی طرح

تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں اس حالت میں غصہ میں بھری سلمان کو گود میں لئے اپنے کمرہ میں پہونچی وہ سو گیا تھا پلنگ پر لٹا دیا۔ اتنے ہی میں سرکار تشریف لے آئے میں سلمان کو کلیجہ سے لگائے بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی گھبرا گئے اور پوچھا۔

کیوں ؟ خیر تو ہے ؟

میں آبدیدہ ہوکر ان سے کہنے لگی کہ اس کا پنڈا پھیکا ہو گیا وقت کی بات ہے میں چوک گئی اتنا کمبخت بھی ادھر چلی گئی، عرفان نے طوطے سے کٹوا دیا اتنا سارا جیتا جیتا خون نکل گیا، یہ بلک رہا تھا وہ ہنس رہا تھا میں نہ آتی تو ساری انگلی الگ ہو جاتی۔

سرکار کی حالت تو اتنا سنتے ہی کچھ سے کچھ ہو گئی وہ بغیر کپڑے اتارے باہر گئے اور عرفان کو اٹھا کر دالان سے انگنائی میں پھینک دیا، چھ برس کے بچہ کی بساط ہی کیا ہاتھ کی ہڈی چڑ سے ٹوٹ گئی۔ ایسی حالت میں سرکار نے اس کے کپڑے اتروائے اور ہنٹر لے کر اس قدر مارے کہ تمام کھال ادھڑ گئی بے گناہ معصوم کے پاس قصور سے بری ہونے کی کوئی شہادت نہ تھی وہ سر سے پاؤں تک خون میں ڈوب چکا تھا اور کوئی حمایتی لاوارث عرفان کا ایسا نہ تھا جو ہم ظالموں کے قبضہ سے مظلوم کو نکال لے آخر سرکار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا اور سلمان کو گود میں لے کر بیٹھ گئے میں اس وقت نہایت خوش دل میں ہنستی ظاہر میں ٹھنڈے سانس بھرتی باہر آئی رات چاندنی تھی آٹھ بج چکے تھے، ڈیوڑھی میں کھسر پھسر کی آواز کان

میں آئی، میرا قدم دھرنا تھا کہ احسان عرفان کا بڑا بھائی جو اب دس برس کا تھا میری صورت دیکھتے ہی سہم گیا اس کی گود میں عرفان کا سر تھا وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

یہ سو گیا جاگتا ہی نہیں میں اس کو ابھی لے جاتا ہوں"

احسان نے رو رو کر کچھ اس درد سے بھائی کی حالت بیان کی کہ اس وقت میں بھی لرز گئی دیکھتی ہوں تو عرفان بیہوش پڑا ہے، گھبرا کر گھر میں آئی سرکار کی آنکھ لگ گئی تھی، صندقچی کھول کر عطر نکالا۔ ٹرنک منگوا کر کپڑے نکالے، لے کر آئی تو دونوں بچے جا چکے تھے۔ خاموش آکر بیٹھ گئی، معاملہ پر غور کیا تو بن ماں کا بچہ بے گناہ تھا اس پر جو ظلم ٹوٹا وہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے اس کی عبرتناک تصویر اس کا میرے آگے ہاتھ جوڑنا۔ بلکنا اور رونا میرے کلیجہ کے پار ہو رہا تھا دل نے اس وقت یہ صدا دی اشرف زندگی کا اعتبار نہیں اگر آج تیرا دم نکل گیا تو عرفان سے بدتر حالت سلمان کی ہوگی اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ سلمان کی یہی تصویر آنکھوں میں پھر گئی برقع اوڑھ باہر نکل گئی، کوٹھی کے سامنے قبرستان تھا، چاندنی رات میں دو معصوم بچے ایک قبر پر نظر آئے چھوٹا بیہوش تھا اور بڑا اس کی صورت دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔ میں چپکی کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی دفعتہً چھوٹا کسمسایا اور بڑے نے اس کے منہ پر منہ رکھ کر کہا۔

بھائی اٹھ بیٹھ"

عرفان۔" بھائی میرے ہاتھ میں بڑا درد ہو رہا ہے ہاتھ نہیں اٹھتا، ابا جان نے جو باہر پھینکا تو چوٹ لگ گئی۔"

احسان:- "لا میں اپنا کرتا اُتار کر باندھ دوں۔ ہمارا بھی تو اللہ ہے اب ہم بڑے ہو جائیں گے تو آپ کمانے لگیں گے۔

عرفان:- اچھی بھائی خدا کے لئے میرا سر دبا دے بڑا درد ہو رہا ہے۔ تیلی آدھی گھس گئی ہے۔ پھر ستون گھسا۔ میری اماں ہوتیں تو وہ دبا دیتیں۔"

احسان:- "اماں کے سامنے ابا ہی کیوں مارتے اما ہی کے مرنے سے تو ہماری مٹی ویران ہوئی۔ اس قبر میں اما میری سو رہی ہیں۔ اما جان ہم کو بھی اپنے کلیجہ سے لگا لو۔

یہ کہہ کر دونوں بھائی لپٹ گئے اور چیخیں مار مار کر رونے لگے اسوقت میری حالت بھی بگڑ چکی تھی۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی اور ظلم ناحق کی سزا دوزخ کے شعلے میرے روبرو بھڑک رہے تھے میں دونوں کو اُٹھا کر گھر لائی۔ رات بھر ان کی خدمت کی صبح اُٹھتے ہی ڈاکٹر کو بلایا۔ ہاتھ پر پٹی بندھوائی اور سچے دل سے خدا کے حضور میں توبہ کی۔ وہ دن اور آج کا دن یہ تینوں اب جوان جوان میرے سامنے بیٹھے ہیں ان میں رتی بھر فرق کیا ہو تو خدا کے ہاں کی دیندار ہوں۔ پیارے بچو! احسان عرفان اس ظلم کی آج تم دونوں سے معافی مانگتی ہوں میری زندگی ختم ہو گئی اور اب میں اس جگہ جا رہی ہوں جہاں ہر فعل کی جزا اور ہر کام کی سزا بھگتنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم مجھ پر اس ظلم کا دعویٰ کرو۔

اب دونوں بچے اشرف جہاں بیگم کو لپٹے ڈاڑھیں مار مار کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"امّاں جان ہمیں تو وہ بات ایک خواب سی یاد ہے۔ ہاں یہ اچھّی طرح یاد ہے کہ آپ کی محبت نے حقیقی ماں کو بھلا دیا۔"

اب اشرف جہاں بیگم نے کہا پیاری بچّیوں ممکن ہے تم کو بھی میری طرح ایسے بچّوں سے سابقہ پڑے مگر یاد رکھو کہ ان کے دکھتے ہوئے دلوں کی آہ اچھی نہیں ہوتی۔ جس طرح میں اپنے فعل پر نادم ہو کر آج خدا کے حضور میں سُرخ رو جا رہی ہوں۔ اسی طرح جانے کی کوشش کرنا اور وہ موت ایسی ہوگی جس پر ہزاروں زندگیاں قربان ہوں۔

سنہ ۱۴ء

اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

یہ خیال کہ افتخار کلثوم عاشق زار ماں تھی یقیناً غلط ارشاد اور فردوسی دونوں اس کے اپنے پیٹ کے بچے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ ارشاد اجلا بہل بہلونٹی کا بچہ لڑکے کی ذات مگر جو لگن کلثوم کو فردوسی کی تھی اس سے آدھی کیا بلکہ چوتھائی بھی بچہ کی نہ تھی، دس گیارہ برس کا بچہ اور گندا سندا نہیں میلا کچیلا نہیں صاف ستھرا اور گورا سفید لیکن ساری ساری رات بخار میں تڑپا اور اس نیک بخت نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تعجب تو کم ہوتا نہیں مگر دل کو یہ کہکر تسکین دے لو کہ ما ارشاد کو فقط دودھ پلانے کی گنہگار تھی وہ بھی ڈیڑھ دو برس نہیں گنتی کے آٹھ سات مہینے ورنہ وہ پلا دادی کی آغوش میں اور بڑھا باپ کی گود میں پورے پانچ برس کا بھی نہ تھا کہ کلکتہ بھیجدیا گیا اور گیا گیا لوٹا چار سال بعد اس جدائی نے اگر افتخار کو اتنا صبر دیدیا کہ اس نے زندہ بچہ کو مردہ سمجھ لیا تو اسی کا دل گردہ تھا، ہاں فردوسی کے ساتھ اس کو محبت اور عشق کیا پردا نہ تھی فدا تھی قربان تھی اس کا بس چلتا تو شاید کلیجہ چیر کر بچی کو اندر بٹھا لیتی کہ اس کو کسی دنیوی اذیت کی ہوا بھی نہ لگے، تیہے کی اتنی تیز اور مزاج کی اسقدر کڑوی کہ دوسرے رشتہ دار اور عزیز تو رہے طاق میں افتخار کے حقیقی بھائی بہن کی اتنی مجال نہ تھی کہ بھانجی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لیں جوان بیوہ ہوئی اور بیس پچیس روپے کی آمدنی کے سوا کوئی معقول اثاثہ بھی نہ تھا مگر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چنی ماں زندہ باپ جیتا بہنیں موجود

بھائی موجود مگر پر محلہ بسا الگ گھر میں رہی اور یہ گوارا نہ کیا کہ فردوسی کو
کوئی عزیز آنکھ بھر کر دیکھ لے ۔ چھوٹی بہن کی شادی میں بیسیوں نکتوڑوں اور
سینکڑوں نخروں سے آئی اور صرف اتنی سی بات پر کہ اور کسی نے بھی
نہیں فردوسی کی حقیقی نانی افتخار کی سگی ماں نے صرف اتنا کہہ دیا کہ میرا
آٹھ آنہ کا آئینہ تمہاری بچی نے توڑ دیا ۔ افتخار اُٹھتی آ گے چھینک ڈولی
منگوا چلتی ہوئی ، ہر چند ماں نے سر ٹپکا باپ نے منتیں کیں بہنوں نے
ہاتھ جوڑے بھائیوں نے خوشامدیں کیں حد یہ ہے کہ تمام مہمانوں نے کہا
مگر وہ رکنا تھا نہ رکی اور یہ بھی کہہ گئی کہ میری بچی شریر ہے اس وقت تو
آٹھ آنہ کا معاملہ تھا میں نے بھر دیا ۔ کوئی بڑا نقصان کر دیا تو کیا کروں گی ۔
آپ بھلی اور اپنا گھر بھلا بھرا گھر دیکھتا رہا اور افتخار یہ جا وہ جا ۔

(۲)

یوں تو افتخار کی زندگی کے اکثر واقعات تعجب انگیز ہیں لیکن وہ تعجب
جو اچنبھے اور حیرت سے بڑھ کر دل کو مشکل سے لگتا اور قیاس میں دقت
سے آتا ہے ماں بیٹوں کے تعلقات ہیں باپ کے بعد ارشاد کا کلکنہ رہنا
ناممکن تھا ۔ مگر تقدیر نے باپ کی موت کے ساتھ ہی ماں کا کلیجہ اتنا پتھر کر دیا
تھا کہ اس کو دیس اور پردیس دونوں یکساں تھے یہ فیصلہ سر اور آنکھوں
پر کہ فردوسی کی محبت نے اس کو اتنا اندھا اور بہرا کر دیا تھا کہ وہ سننے اور
دیکھنے دونوں سے معذور تھی مگر مقابلہ ایسا تعجب انگیز اور حیرت فزا
ہے کہ عقل چکراتی ہے قیاس ٹکراتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ فردوسی
کی عاشق زار ماں ارشاد کے واسطے ایسی ڈائن ہوئی کہ دنیا نے پناہ
مانگی ۔ مجبوری یا معذوری دنیا دکھانے کو یا خدا کے خوف سے کھانا

تو وہ دونوں وقت یتیم ارشاد کو پیٹ بھر کر دے دیتی وہ بھی فردوسی کے بعد اور اس کا بچا کھچا، لیکن فصل کا میوہ موسم کی ترکاری یہ نہیں کہ آتی نہ ہو فردوسی کے لئے سب کچھ آتی مگر ارشاد کے واسطے حرام تھی دونوں بچوں میں بیگم اور غلام کا فرق تھا۔ ہم کو یہ بھی تعجب ہے کہ افتخار نے یہ کیوں جائز سمجھا کہ ارشاد آیا ہے حالانکہ وہ نوکروں کی طرح منّت و خوشامد کرتا پیچھے پیچھے پھرتا لڑائی جھگڑا تو درکنار اتنی ہستی نہ تھی کہ اس کے حکم پر نا کر سکے صرف اتنی سی بات پر کہ بہن کا کھلونا اور وہ بھی مٹی کا لنگڑا گھوڑا طاق سے نیچے اتار لیا تھا دو تھپّڑ ماں نے اس زور سے رسید کئے کہ کلّا لال ہو گیا۔

افتخار عورت کیا گھرّا چِنا تھی کہ سب سے الگ تھلگ رہتی۔ خود کہیں جاتی نہ اور کو بلاتی ظالم کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ اگر کسی سے بگڑتی تو باوا دادا کے وقت کی باتیں بیان کرتی۔ شب برات کے موقعہ پر دو ڈھائی آنہ روز کی آتشبازی فردوسی منگواتی اور ارشاد چھوڑتا کمبخت کی قضا جو آئی تو ماں سے کہنے لگا اگر تم مجھ کو اکٹھا سودا منگوا دو تو سب چیزیں میں خود تیار کر لوں اور ایک روپیہ میں چار پانچ روپیہ کا مال ہو جائے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ افتخار کو کیا عذر ہو سکتا تھا بچی کے لئے جان تک حاضر تھی، روپیہ نکال دیدیا اور لڑکا جھٹ پٹ جا سودا لے آیا بارود پیس رہا تھا کہ رگڑ لگی اور اس زور کا دھماکا ہوا کہ غریب کی دونو آنکھیں اور ایک ٹانگ رخصت ہوئی۔

افتخار میں مروت محبت شفقت انسانیت اگر کوئی چیز ہو گی تو شاید شوہر کی زندگی میں اب تو اس کی دنیا و دین جنت دوزخ جو کچھ

تھی وہ فردوسی اور صرف فردوسی۔ لطف یہ تھا کہ زخمی ہوا ارشاد اور بخار چڑھا فردوسی کو افتخار اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو ارشاد جیسے سات لڑکے اور پرائے نہیں اپنے پیٹ کے فردوسی پر قربان کر دیتی، غریب پڑا تڑپ رہا تھا اور ماں بچی کو گود میں لئے اس کے زخموں پر یہ کہہ کہہ کر اور نمک چھڑک رہی تھی کہ تو تو مرد ذات ہے لوٹ پیٹ کر اچھا ہو جائے گا۔ میری پھول سی بچی کیسی پڑی اگر ایسی ویسی ہو گئی تو میں تیرا کیا کر لوں گی۔

فردوسی کا بخار معمولی تھا صبح کو اتر گیا مگر افتخار کی حالت روز بروز ردی ہوتی گئی۔ دوا ہوئی نہیں آرام کس طرح ہوتا۔ خدا بھلا کرے دادی کا کہ وہ پوتے کو اپنے ہاں لے گئی اور بدنصیب بچہ کا دم بجائے ماں کی گود کے باپ کے ماں کی گود میں نکلا

(۳)

جس ماں نے ارشاد جیسا بچہ فردوسی پر قربان کر دیا اس سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ایک غیر مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بچی کو چھوڑ بیٹھتی۔ جو پیغام آتا وہ حقارت سے نامنظور اور نفرت سے مسترد، لینا چاہتی تھی گھر داماد مگر شرط یہ تھی کہ اپنی دولت لائے اور یہاں بیٹھ کر لٹائے۔ فردوسی کی عمر ڈھل رہی تھی مگر بات ڈھنگ کی نہ آئی عزیزوں میں سے کسی کی اتنی مجال نہ تھی کہ افتخار کو ٹوک سکتا، محلے والے یا ملنے والے تو حق ہی کیا رکھتے تھے، مگر جن ڈھونڈھیاں ان پائیاں دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہی اور بی فردوسی کی شادی رچ گئی، تحریری اقرار اور زبانی معاہدوں میں جس طرح افتخار نے داماد کو جکڑا اس کو دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر مرد

بھی دنگ تھے۔ داماد دوسو روپے کا ملازم اور بیوی اور ساس دونوں کا غلام تھا بارہا فردوسی کی طرف سے ایسی لغزشیں ہوئیں کہ دوسرا شوہر مشکل سے صبر کرتا مگر اس نے اگر ٹیڑھی آنکھ سے بھی بیوی کو دیکھ لیا تو افتخار نے حشر برپا کر دیا اور صاف کہدیا کہ تم اپنے گھر خوش میں اپنے میری بچی رزق کی ماری نہیں، سلائی سیوں گی اور اس کا پیٹ پالونگی"

اس کامیابی کی تہ میں کہ ایک بڈھا شوہر جوان بیوی کی نازبرداری کر رہا ہے جو مصیبت پنہاں ہوتی ہے وہ افتخار اور فردوسی دونو کے سر پر منڈلا رہی تھی یہ درست ہے کہ سہاگ کے دس بارہ سال فردوسی کے ایسے گذرے کہ سبحان اللہ مگر بالآخر شوہر کی موت نے فردوسی کی گود میں دو معصوم بچے ڈال سہاگ کا خاتمہ کیا اور اب اس دورعیش کی یادگار یہ دو بچے تھے۔

ہم افتخار کے استقلال کی داد دیتے ہیں کہ اس نازک وقت میں بھی اس کا قدم نہ ڈگمگایا اور اس نے کسی عزیز کی مطلق پروا نہ کی، داماد نے جو تھوڑا سا زیور چھوڑا تھا اس کو فروخت کیا اور اس مرغی کی طرح جو چیل کے جھپٹے سے بچائے اپنے بچوں کو پروں میں لئے بیٹھی ہے فردوسی اور اس کے دونوں بچوں کو کلیجہ سے لگائے مردانہ وار ہر تکلیف کا مقابلہ کرتی رہی اور گھر کی ہوا نہ بگڑنے دی۔ زیور ختم ہو چکا تو اب وہ مکان تھا جو افتخار کی دوراندیشی سے فردوسی کی ملکیت ہو چکا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ بچی کسی کی نظروں میں ذلیل نہ ہو اس نے اپنے دونوں مکان علحدہ کر کے بچوں کی پرورش کی اور

فردوسی کی حویلی پر آنچ نہ آنے دی۔

فردوسی کا بڑا لڑکا ظہیر جس نے باپ کے بعد چنے کھا کر پڑھا انٹرنس کے بعد ڈاکٹری میں پہونچا اور وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا، جب افتخار امتحان کے دنوں میں نواسہ کے ساتھ دروازہ تک آتی ایک باسی روٹی اس کو دیتی اور کہتی اس وقت گھر میں اس کے سوا کچھ موجود نہیں خدا تیرے ساتھ ہے ہمت نہ ہار بیڑا پار ہے۔

(۴)

ظہیر تین سو روپے ماہوار کا نوکر ہے چار ہزار روپے اس کی تنخواہ میں سے ماں جمع کر چکی ہے اور جس گھر میں مٹھی بھر چنوں کے لالے تھے آج اس میں گہما گہمی ہو رہی ہے۔ ظہیر کی شادی ہے مہمان بھرے ہیں دلہن کا جوڑا اور زیور کشتیوں میں چنا ہوا ہے۔ مردانہ میں دیگیں چڑھی ہوئی ہیں کمرہ میں اُجلی چاندنیاں دالانوں میں نئے قالین، انگنائی میں کورے تخت فردوسی باغ باغ اور نہال نہال ادھر ادھر پھر رہی ہے چاروں طرف سے مبارکبادیں مل رہی ہیں اور ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر شکریہ ادا کر رہی ہے۔

اس مکان کے چپہ چپہ اور کونہ کونہ پر خوشی کی چھڑیاں لگ رہی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنج و غم کا اس سرزمین پر کبھی گذر ہی نہیں ہوا۔ البتہ صدر دالان کے برابر والی کوٹھڑی میں ایک بڑھیا جس کی عمر نوّے برس کے قریب ہے اور جواب صرف ہڈیوں کی مالا ہے اس لئے کہ فالج نے اس کا ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ بیکار کر دی خاموش پڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھت کی کڑیاں گن رہی ہے اس کے قوی

بیکار ہیں بصارت جواب دے چکی ہے ہاتھ پاؤں کا سکت جاتا رہا چلنے پھرنے کے قابل نہیں کھانسی نے جان پر بنا دی کمر جھک گئی چپکی لیٹی ہے مگر نہ معلوم عمر گذشتہ کے کیا کیا خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں بریانی اور تلنجن کی خوشبو اس کے دماغ میں آئی اور اس نے خیالی پلاؤ پکانے شروع کئے، کھانا آگیا سب سے پہلے فردوسی مجھ کو لاکر دے گی" میں کھاؤں گی ہی کتنا ایسے میں تو گرم گرم ہے پھر ٹھنڈا کس کام کا ہائیں یہ تو سب کھا بھی رہے ہیں کیا فردوسی مجھے بھول گئی۔ اس کو میری مطلق پروا نہیں۔ افتخار دل ہی دل میں بلکہ تھوڑی بہت آواز سے بھی یہ باتیں کر رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی آہٹ اس کے کان تک پہنچی اور اس کی افسردگی خوشی سے بدلی مگر جب آواز ادہر آنے کی بجائے اُدہر جاتی معلوم ہوئی تو افتخار نے آہستہ آہستہ پکارا فردوسی اے بی فردوسی" مگر اس کی آواز کا کسی نے جواب بھی نہ دیا۔ مہمانوں کے کھانے پینے کی اواز برابر کان میں آتی رہی اور آج افتخار کو معلوم ہوا کہ اُس نے اپنی عمر میں اچھے بیج نہ بوئے۔ یہاں تک کہ کھانا ختم ہوا اور ایک بیوی جو کسی ضرورت سے ادہر آنکلی تھیں گھبرا کر باہر آئیں اور کہا "فردوسی بیگم تم نے تو

دماغ سڑوا دیا۔ تمہاری اماں والی کوٹھری سے تو ایسی بدبو آرہی ہے کہ مغز پھٹا جاتا ہے" فردوسی نے بغیر کسی تامل کے کہا بوا کیا کہوں مر بھی تو نہیں چکتیں دم ناک میں ہے ساری کوٹھری بلغم اور غلاظت سے سڑا رکھی ہے اور پھر مزاج ساتویں آسمان پر ایک کہوں تو ہزار سنوں اتنا کہہ کر فردوسی ماں کے پاس آئی، جس کے کان میں یہ آواز اچھی طرح آرہی تھی۔ اور کہا "مہانوں تنگ میں ناک کٹوادی، اس کوٹھری کو تین دفعہ بند کر چکی ہوں کہ اندر مری رہو۔ مگر بغیر کھولے چین نہیں ابتو ہاتھ خاصا اُٹھ جاتا ہے" بڑھیا چھ سات روز سے دمہ میں مررہی تھی مگر سوکھی پنجیوں میں جوش آگیا جواب کا قصد کیا۔ لیکن سانس نے زبان نہ اُٹھنے دی اور شدت کی کھانسی اُٹھی ایک میلی سی ڈبیا افتخار کے سرہانے جل رہی تھی وہ کھانسی میں بے چین تھی مگر اس کی نگاہ بیٹی کے چہرہ پر تھی اور اس نگاہ میں اظہار مجبوری ولاچاری کے سوا عمر گذشتہ کی پوری داستان تھی۔ وہ آنکھیں جو اس بیکسی کے عالم میں اپنی گذشتہ خدمات اپنا عشق و فریفتگی جتا کر صرف چاولوں کے ایک نوالہ کی خواستگار تھیں ابھی زبان سے کچھ کہنے نہ پائی تھیں کہ ہمیشہ کی نیند سوگئیں۔

افتخار کا انجام ماؤں کے واسطے درس

عبرت ہے۔ فردوسی کے عشق میں ارشاد کے
حقوق کا پامال کرنا آسان نہ تھا۔ اور وہ یقیناً
اس سلوک کی سزاوار تھی، مگر بدنصیب
فردوسی جس نے افتخار جیسی عاشق زار ماں
کی یہ گت بنائی قدرت کی زبردست طاقت
سے اس وقت آگاہ ہوئی کہ ابھی وہ کھڑی ماں
کا چہرہ دیکھ رہی تھی کہ یہ آواز اس کے کان میں پہنچی

"غضب ہوا دولھا موٹر سے گر پڑا اور مغز پھٹ گیا"

سنہ ۲۰ء

شہیدِ معاشرت

عرفان کی شادی کو پورا ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ افروز کی طرف سے شکایت پیدا ہو گئی اس شکایت کا حقیقی ذمہ وار کون ہے یہ فیصلہ واقعات کریں گے۔ مگر فقط افروز اس کی وجہ نہیں اگر وہ سیر بھر ہے تو آدھ سیر عرفان اور پان سیر سلمان بیاہی گئی تو تندرست تھی چھڑی تھی اور دل کو یہ یقین تھا کہ نکاح کے معنی شوہر کی فرماں برداری ہیں جتنی ممکن تھی کی۔ خدا کے فضل سے گھر میں نوکر چاکر لونڈی ماما سب موجود تھے مگر نہ معلوم اس اللہ کی بندی کو کیا مزا آتا تھا کہ عرفان کا کام آدھی ہو یا پچھلا اپنے ہاتھ سے کرتی اور دوسرے کو ہاتھ نہ لگانے دیتی چند روز تو یہ چاؤ چو نچلے خوب نبھے مگر جب بچہ پیدا ہونے میں دو چار ہی روز رہ گئے اور چھکڑا بن گئی۔ تو جگہ سے ہلنا دوبھر تھا عرفان کی نوعمری تمول بیوقوفی غرض وجہ جو کچھ ہو نتیجہ یہ کہ وہ بیوی کی مجبوری کو تساہل سمجھنے لگا اور دل ہی میں نہیں کئی مرتبہ اُس کے منہ پر بھی رکھ دیا افروز شوہر کہتا نہ کہتا ہاتھ سے پاؤں سے ترکیب سے تدبیر سے اب بھی جو امکان میں تھا اس سے باہر نہ تھی۔ ایک روز رات کے وقت شاید دس بجے ہوں گے عرفان کھانا کھا رہا تھا اور افروز پاس بیٹھی، عرفان کو اُچھو ہوا بڑی بی سامنے موجود تھیں مگر اونگھ رہی تھیں صراحی دور تھی، افروز اُٹھی مگر مصیبت سے، اُٹھی اور مشکل سے

چلی جب تک پانی آئے اچھو اور تیز ہوا اور اس زور کا کہ آنکھیں نکل پڑیں، پانی آیا مگر دیر میں اور وقت سے، عرفان نے پی بھی لیا اور اچھو بھی جاتا رہا مگر آدھے پیٹ اٹھ گیا اور کہنے لگا۔

تم تو بالکل ہتیا ہو گئیں عورتوں کی تکلیف تو عارضی ہوتی ہے مردوں کو ایسی ایسی اذیتیں ہر وقت پیش آتی رہتی ہیں اگر وہ بھی تمہاری طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں تو دنیا کے کام ہی ٹھنڈے ہوں ابھی میرا دم نکل جاتا۔ بھلا غضب خدا کا گھنٹہ بھر میں پانی لائی ہو۔

یہ سال بھر میں پہلا اتفاق تھا کہ افروز نے شوہر کی ایسی گفتگو سنی خاموش ہو گئی کوئی جواب نہ دیا عرفان بڑبڑاتا۔ باہر چلا گیا اور وہاں سے کہلا بھیجا کہ میں چند روز کے واسطے باغ جاتا ہوں۔

اس واقعہ کی ذمہ داری کس پر ہے یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے، قصور عرفان کا ہے یا افروز کا اس کا جواب مشکل ہے، ہم تو جہاں تک غور کرتے ہیں ہماری راستہ میں قصوروار ہیں تو دونوں اور بے قصور ہیں تو دونوں اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ افروز اگر شروع ہی سے انجام کو ملحوظ رکھتی اور عرفان کی عادتیں اس حد تک نہ بگاڑتی کہ وہ مزے سے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ ماما ئیں سو گئیں اور خود لالٹین لیکر مکان کا دروازہ بند کرنے جارہی ہے تو غالباً یہ وقت نہ آتا لیکن جب اس کے اس تعلق کا مقصد ہی عرفان کا دل فتح کرنا تھا تو وہ اس سے بھی چوگنی خدمت کرتی تو اعتراض نہیں تیسرا اب یہ فیصلہ سننے والے اور پڑھنے والے کریں کہ ذمہ دار کون ہے

میاں یا بیوی ہاں اتنا کہنے میں ہمیں بھی باک نہیں کہ عرفان منہ پر آنکھیں ہوتے ساتھ اندھا تھا۔ نوکر اور غلام تک مجبوری میں معذور ہیں ممکن ہے افروز کا درجہ اس کی رائے میں نوکر سے بھی بدتر ہو اور ممکن کیلئے ہے یقیناً تھا ورنہ یہ نوبت کیوں آتی۔

عرفان کے جانے کے بعد افروز معاملہ کی نوعیت پر غور کرنے لگی تو اس کو قصور تو نہیں مگر اپنی غفلت ایمان کے آئینہ میں صاف نظر آ رہی تھی پہلی یہ کہ کھانے سے پہلے پانی کی صراحی اپنے پاس کیوں نہ رکھوائی اور دوسری یہ کہ اگر خود معذور تھی تو ماما سے فوراً پانی کیوں نہ مانگا سوچتے سوچتے اس کا تخیل اس سلسلہ میں شادی کے مسئلہ پر کھٹکا اور وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی کہ۔

ہمارے موجودہ تمدن کو ملحوظ رکھتے ہوئے شادی کی ضرورت لڑکے سے زیادہ لڑکی کو ہے۔ غلط ہے یا صحیح یہ دوسری بحث ہے مگر حقیقت یہ ہی ہے کوارپنے کا زمانہ طویل ہونے سے جو کرب لڑکی کے والدین کو ہوتا ہے لڑکے کے نہیں ہوتا۔ لڑکے والوں کی جو حقیقت ہے اس کو ارمان کہہ سکتے ہیں خواہش کہہ سکتے ہیں۔ تلاشِ مسرت کہہ سکتے ہیں لیکن لڑکی والوں کی کیفیت تعبیر ہوگی ایک اضطراب سے ایک کرب سے ایک پریشانی سے ان حالات میں عرفان کا اپنی آمدنی میں میرا بار ڈالنا اور اس کو آسانی گوارا کرنا اس وقت میں جائز ہے کہ میں اس کے واسطے وجہ راحت ہوں اگر مجھ سے اس کو آرام نہ پہونچے تو وہ دیوانہ ہے جو میرے حقوق ادا کرے اور میں بے غیرت کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کروں۔

عرفان باغ میں پہنچا تو رستہ بھر ان ہی خیالات میں مستغرق اور وہاں پہونچکر اسی اُدھیڑبن میں منہمک وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ نقصان جو مجھ کو پہنچا یعنی خاصی اچھی بھلی چنگی خدمت کرنے والی بیوی جس نے سال بھر تک نوکر اور ماما عزیز او اقارب سب کو پرے بٹھا دیا بالکل بیکار ہوگئی اس کی کیا "تلافی کروں اگر افروز شروع ہی سے مجھ کو اس راحت و آسائش کا عادی نہ بناتی تو مجھ کو شکایت نہ تھی میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ مکرا پن کرتی ہے اور جان بوجھ کر کام چور بنتی ہے۔ مگر ہاں یہ شاید کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر چاہے تو اس سے زیادہ کر سکتی ہے جتنا کرتی ہے، آخر اسی حالت میں پرسوں اپنے دو پٹہ پر کنارہ ٹانکا اور میرے شامی کباب ماما کے سپرد کر دیئے۔

ان دونوں مسلمان میاں بیوی کے خیالات سننے اور یہ دیکھنے کے بعد کہ ایک مسلمان لڑکی کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ وہ صرف مرد کی خدمت کو بنائی گئی ہے مساوات تو درکنار وہ بھول کر بھی شوہر کے مقابلہ میں اپنی ہستی کو ذرہ بھر وقعت نہیں دے سکتی، اور ایک مسلمان شوہر کو یقین کامل ہے کہ بیوی بھی ایک قسم کی لونڈی ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ دن رات میری خدمت میں مصروف رہے کیا کوئی مسلمان یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ عورت کی وقعت اسلام نے سب سے زیادہ کی اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا قوم اس پر عمل کر رہی ہے اور اگر نہیں تو اس کی ذمہ داری سب شوہروں پر ہے یا بیویوں پر۔

آسمان پر ابتک کہ پانی دھواں دھار برس چکا تھا سیاہ گھٹا چھائی ہوئی تھی بجلی اور بادل کے خاموش ہوتے پر عرفان نے اپنی

پلنگڑی باہر صحن میں بچھوائی۔ اس ہی اُلجھن میں لیٹا اور اسی چکر میں سویا آنکھ لگی تو ایک عجیب خواب نظر آیا دیکھتا کیا ہے۔

ایک عظیم الشان جیلخانہ میں کھڑا ہے جہاں ہر طرف قیدی ہی قیدی بھرے ہیں ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں گلے میں طوق ہیں دوپہر کا وقت ہے گرمی کا موسم لو کے تھپیڑے زور شور سے چل رہے ہیں مگر ان مظلوم قیدیوں کو مشقت سے دم بھر کا چھٹکارا نہیں۔ ایک جمعدار آتا ہے دو چار ڈنڈے لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے دوسرا آتا ہے۔ ایک آدھ لات لگا سیدھا ہو لیتا ہے جو برابر سے گذرتا ہے وہ بھی بغیر گھرکی اور درشتی کے بات نہیں کرتا قیدی تکلیف سے اکتا رہے ہیں مگر مشقت میں کمی نہیں کرتے سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہیں لیکن تیوری پہ بل نہیں آتا پٹ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں مر رہے ہیں اور کر رہے ہیں عرفان یہ سماں دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور دل میں کہنے لگا یہ کیسے سنگدل لوگ ہیں کہ ان بیکس قیدیوں پر رحم نہیں آتا اور یہ قیدی کتنے سیدھے اور کیسے بھولے ہیں کہ ہر تکلیف میں خوش اور ہر اذیت میں رضامند ہیں دن فنا ہو کر رات ہوئی رات ختم ہو کر پھر مگر ان بدنصیب قیدیوں کی اذیت کا خاتمہ نہ ہوا کمال یہ تھا کہ محافظ اور نگراں خود زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہیں مگر ان پر ہر راحت حرام کر رکھی تھی دروازے چاروں طرف کھلے ہوئے تھے راستہ عام تھا مگر قیدی اس جیلخانہ کے ایسے عاشق تھے کہ یہاں سے ان کے جنازے تک نکلتے تھے مگر وہ خود نکلنے کا نام نہ لیتے تھے۔

عرفان چاہتا تھا کہ یہاں کا کچھ حال معلوم کرے کہ ایک نووارد کو دیکھا جو داروغہ سے ایک قیدی کو آزاد کرا رہا ہے بیتاب ہو کر لپکا اور خاموش ہو گیا۔ اب اور بھی زیادہ عرفان کو حیرت ہوئی داروغہ آزادی پر رضامند تھا اور بہ خوشی قیدی کو دے دینے کو آمادہ مگر اس کے آرام و آسائش کی نہایت کڑی شرطیں لگا رہا تھا نووارد نرم آدمی تھا قیدیوں کی مصیبت پر دل پسیج گیا اور جو جو شرائط داروغہ نے پیش کیں سب منظور کر لیں عرفان کو سکتہ تھا کہ منجملہ بہت سی شرائط کے اس قیدی کی بیع دو ہزار روپے کو ہوئی اور جب نووارد روپے دے چکا تو داروغہ نے اس قیدی کو جس پر اب تک غلاموں کی طرح حکومت کر رہا تھا بلا کر گلے لگایا۔ دو ہزار میں اتنی ہی رقم اپنے پاس سے ملائی اور کہا تم آج ہم سے رخصت ہوتے ہو یہ روپیہ اپنے پاس رکھو خدا کرے تمہارا مالک شریف اور رحیم ہو تمہاری اس وقت تک کی خدمات کا پروانہ ہے جاؤ خدا تم کو خوش رکھے نووارد آگے آگے اور قیدی اس کے پیچھے پیچھے اور دونوں کے پیچھے عرفان کیفیت دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ مالک کو پیاس لگی اور اس نے قیدی سے کہا جا کنوئیں سے پانی بھر کر لا۔ رات کا وقت اندھیرا گھُپ نامعلوم جگہ ناواقف آدمی بھٹکتا بھٹکتا گیا اور پانی لایا مگر بجائے شاباش کے مالک نے اس قیدی کے دیر لگانے پر بہت برا بھلا کہا۔ عرفان اس مالک کی حرکت پر جل رہا تھا کہ اس نے قیدی سے پاؤں دبانے کو کہا غلام کو عذر کیا ہو سکتا تھا دبانے بیٹھا تو حکم دیا

ایک ہاتھ سے پاؤں دبا ایک ہاتھ سے پنکھا جھل دو گھنٹہ کے بعد مالک بیدار ہوا تو گرمی سخت تھی قیدی کے ایک لات ماری اور کہا سیدھی طرح پنکھا کیوں نہیں جھلتا، عرفان یہ رنگ دیکھ کر مالک پر دل ہی دل میں لعنت ملامت بھیجنے لگا اب صبح ہو چکی تھی مالک نے قیدی کو کھانا پکانے کا حکم دیا مگر افسوس قیدی مارا مارا کھانا تیار کر کر لایا تو مالک کی ناپسند تھا کہیں نمک کم تھا تو کہیں مرچ زیادہ قیدی خاموش کھڑا تھا مالک نے کھانا اُٹھا کر پھینک دیا اور یہ کہہ کر باہر چلا گیا،

"جب تک میں نہ آؤں دروازہ کھلا اور تو جاگتا رہے"

اب عرفان سے ضبط نہ ہو سکا وہ آگے بڑھا اور مالک سے کہنے لگا "حضرت اس سے تو یہ بدنصیب قیدی جیل خانہ ہی میں اچھا تھا" عرفان کے اتنا کہتے ہی قیدی اور مالک دونوں غائب تھے البتہ دیوار پر موٹے موٹے حرفوں میں یہ لکھا ہو تھا۔

بیوقوف دوسروں کو ٹوکتا ہے اور خود کرتا ہے تو بھی تو اسی گناہ کا مرتکب ہے وہ بیکس قیدی جن پر تیرا دل کڑھا مسلمانوں کی کواری بچیاں ہیں جو حقیقتاً تو نہیں اس لئے کہ کلیجہ کے ٹکڑے ہیں مگر حالات کے اعتبار سے قیدیوں ہی کی برابر سرابر ہیں صبح سے شام تک اور شام سے رات تک گھر کے کام کاج میں پلی رہیں پتلی کی طرح ایک ٹانگ سے پھریں۔ ماں باپ کا غصہ ان پر بڑے بہن بھائیوں کی فضیحتی ان پر کہیں آنے جانے کا حکم ان کو نہیں کسی سے ملنے جلنے کی اجازت ان کو نہیں کیا یہ حالت

قید یوں کی سی نہیں ہے۔ اس حالت پر اعتراض نہیں زمانہ کا تقاضہ اور وقت کی ضرورت سب صحیح مگر کیا یہ رحم کی مستحق نہیں اسی کی سزاوا ہیں کہ بھائی جان کے موزے میں ٹانکا نہیں بھرا تو ہزار فضیحتیں اور ابا جان کے کام کو دیر ہو گئی تو ہزار ملامتیں غور کرو تو شادی ایک قسم کی آزادی ہے کہ وہ احتیاط اور روک ٹوک سب ختم ہوئی اب جس نے آزاد کرا دیا اگر وہی صیاد ہو جائے تو اس سے خدا ہی سمجھے"۔

عرفان اتنا ہی پڑھنے پایا تھا کہ آنکھ کھل گئی اس وقت دل کی حالت کچھ اور ہی تھی۔ افروز کی مجبوری اور اپنی زیادتی سامنے تھی اور رونگٹا رونگٹا اپنے اوپر ملامت برسا رہا تھا، کہتا پر نکل آئیں تو اُڑ کر جاؤں اور افروز سے معافی مانگوں مشکل سے رات کاٹی خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو کیا کھانا اور کس کا پینا اور کس کا ناشتہ آندھی کی طرح چلا اور بگولے کی طرح پہنچا، نادم و شرمسار اندر گیا تو سب سے پہلے اپنے بچہ پر نظر پڑی جو ایک انّا کی گود میں تھا اور اس کے بعد ایک پرچہ پر جو چھوٹی بہن نے لا کر دیا جس میں لکھا تھا:-

میرے سرتاج واقعی مجھ سے خطا ہوئی اور میں قصوروار ہوں مگر آپ اپنے رحم و کرم سے للہ معاف کر دیجئے آپ آقا ہیں میں کنیز ہوں زبردست اور کمزور کی لڑائی کیا، مجھے کافی سزا مل گئی کہ آخر وقت بھی آپ کی صورت نہ دیکھ سکی۔ میرا بچہ آپ کے پاس امانت ہے اس کی دلجوئی کیجئے یہ خدا کے سپرد ہے میری حالت بگڑ گئی، اماں جان سے ہر چند درخواست کی انہوں نے لیڈی ڈاکٹر کو نہ بلایا،

ہندوستانی دائی انگھڑ تھی ظالم نے جان لے کر پیچھا
چھوڑا مجھ کو اپنے قصور کی کافی سزا مل گئی کہ دم آنکھوں
میں ہے مگر نگاہ دروازہ پر اور کان آواز پر دنیا اور دنیا کے
آیندہ تعلقات خدا کرے آپ کے واسطے خوشگوار ہوں
مگر میری آخری التجا ہے کہ اس درخواست کو پڑھتے ہی
میری خطا معاف کر دیجئے میں عذاب آخرت سے
محفوظ رہوں ارمان تھا کہ اپنے ہاتھ سے سپرد زمین کرتے
دل کی حسرت دل ہی میں رہی اچھا میرے سرتاج!
[illegible] منیرہ خدا نگہبان۔

پرچہ پڑھتے ہی خاوند کو سکتہ ہو گیا معلوم ہوا کہ فرزند کو مرے
تیسرا روز ہے قبر پر گیا مگر زندگی کی نخوت ایمان کا ایسا نقصان کر چکی
تھی جس کی تلافی دوسری زندگی بھی نہ کر سکتی تھی۔

سنہ ۲۱ء

توصیف کا خواب

(۱)

یہ صرف تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ سلطان توصیف ایک غریب باپ کی بیٹی اور معمولی ماں کی بچی داؤد جیسے متموّل تاجر کی بہو بنی باپ کے بعد اس کا شوہر موسیٰ ایک کڑور پتی سوداگر تھا جس کی دو چار نہیں بیسیوں کوٹھیاں اور دس پانچ نہیں سینکڑوں کارخانے ادہر اُدہر موجود تھے، بنگال کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہوگا جہاں موسیٰ کی تجارت نہ ہو اس شادی کا سبب اور نکاح کی وجہ توصیف کی تقدیر یا موسیٰ کی قدردانی تعلیم کا انجام یا شرافت کا نام جو کچھ بھی ہو اس نکاح کا نباہ اور اس کاج کی لاج کا سہرا توصیف کے سر ہے۔ خدا کی شان نظر آتی تھی کہ وہ موسیٰ جس نے کبھی خدا کے سامنے سر نہ جھکایا ہو بیوی کا کلمہ پڑھ رہا ہے اور وہ توصیف جس کے جہیز کی کُل کائنات ایک صندوق برات کے ساتھ تھا دن رات جواہرات میں کھیلتی یہ صرف علم ہی کا طفیل اور تعلیم کا صدقہ تھا کہ مردانہ میں نکاح ہورہا ہے زنانہ میں مہمان بھرے ہیں اور توصیف سلطان اس خیال میں غرق ہے کہ بیل منڈھے چڑہتی دکھائی نہیں دیتی دولت جس کے کاٹے کا منتر نہیں صورت جس جادو کا اتار نہیں دونوں غائب۔ اب لے دے کر رہی سیرت، محبت، عادت، خصلت یہ ہی ہتیار ہیں جن پر فتح کا دارومدار ہے خدا ہی بیڑا پار کرے تو ہو بہ ظاہر تو یہ کشتی منجدہار میں ڈوبی۔

سسرال پہونچی تو رئیسانہ شان امیرانہ ٹھاٹ، نوکروں کا زور ماماؤں کا شور دولت کی کثرت، روپیہ کی ریل پیل چاہیے کہ باغ باغ ہوتی، نہال نہال ہوتی مطلق نہیں، ہر وقت اپنی دھن میں غرقاب اور فکر میں شرابور موسیٰ امیر کا بچہ لاڈلا اور اکلوتا دنیا اس کے قدموں میں آنکھیں بچھائے الفت سے ناآشنا محبت سے ناواقف فرائض کی وقعت اور حقوق کی تربیت اس کی نگاہ میں ہو ہی نہ سکتی تھی ایسے شوہر کے دل میں گھر کرنا لوہے کو نرمانا اور پتھر کو جونک لگانا تھا۔ مگر بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے۔ توصیف نے اپنے سامنے صرف رضامندی شوہر کا مقصد رکھا اور اس کے حصول میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا یہ صحیح ہے کہ تعلیم کی طاقت بھی کچھ کم وزن نہ رکھتی تھی مگر بہ حیثیت مجموعی داؤد کا پاسہ بہت زبردست تھا وہ تموّل کے ساتھ ہی دولت حسن سے بھی مالا مال تھا اور اس کا حق توصیف کے مقابلہ میں قطعاً فائق تھا ان حالات میں بیوی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ صورت کی کمی اطاعت سے پوری کرے۔

نکاح کے وقت موسیٰ کے ماں اور باپ دونوں زندہ تھے اور دونوں عاشق زار وہ فطرتاً گوارا ہی نہ کر سکتے تھے کہ بچہ کے دل پر محبت کا چرکا تو درکنار آنکھ میں ملال کا میل تک آئے۔ لیکن جال اور دانہ دونوں سامنے تھے اور موسیٰ کی کیفیت اس وقت بالکل اس پرندکی تھی جو پھندے میں پھنستے ہی جھٹکا مارے اور پھڑپھڑا کر نکل جائے اگر توصیف اس وقت پورا لاسہ نہ لگاتی تو موسیٰ چلا ہی

تھا اس نے ایک تین ہی مہینہ میں وہ خدمت کی کہ اکیس برس
کی کھلائی بڑھیا کی خدمات دل سے بھلا دیں ہم پہلے بھی کہہ چکے
ہیں کہ توصیف کا عورت ہونا اس کی کمزوری نہ تھی بلکہ دوسرے
سامان تھے دوسرے اسباب تھے دوسرے باعث تھے، شکل
وصورت کے اعتبار سے مالی حالت کے اعتبار سے عزت
وجاہت کے اعتبار سے وہ کمزور اور یقیناً کمزور تھی۔ اس گڑھے کو
بھرنا اس کا فرض تھا اطاعت سے بھرا خدمت سے بھرا سچ
بھرا جھوٹ بھرا غرض جس طرح بھرا جائز اور درست ؛

باوجود اس اعتراف کے موسیٰ اور توصیف کے حقوق قریب
قریب برابر تھے ہم توصیف کی اس دور اندیشی کی لاریب داد دیں
گے کہ اس کا یقین اس کا ایمان اس کا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا کہ اس کے
گھر میں میرا اضافہ بامعنی ہے اس وقت جب میری ہستی اضافہ
کرے موسیٰ کی راحتوں میں اس کی خوشیوں میں اس کی مسرتوں میں،
اس یقین کا ثمر اس عقیدہ کا نتیجہ اس ایمان کا انجام ظاہر تھا
روشن تھا صاف تھا کہ ایک موسیٰ کیا ادنیٰ سے اعلیٰ اور چھوٹے
سے بڑا ہر متنفس اس کا گرویدہ تھا۔

(۳)

توصیف کی زندگی کا یہ دور اور بے فکری کے دن پانچ سال
تک مستقل رہے چھٹے سال ساس کی موت نے اس کی حالت میں
ایک خاص تغیّر کیا اور اب داؤد کی بہو گھر کی ملکہ بنی اس اکرام
واعزاز نے ایک اور ذمہ داری بڑھائی اور اب خسر کی راحت

و آسائش کا بار بھی اسی کے سر تھا اس ترازو میں بھی توصیف ٹا کم ٹوک اتری اور اس خوش اسلوبی سے فرائض ادا کئے کہ داؤد بیٹے سے زیادہ بہو کا دلدادہ تھا توصیف کی یہ خدمت یا اطاعت خیال یا فکر عارضی اور چند روزہ تھا مگر اس کی تہ میں بیش بہا خزانے اور بیش قیمت جواہرات پوشیدہ تھے روحانی یا جسمانی اذیت جو اس سلسلہ میں توصیف نے بھگتی فانی تھی مگر اس کے پھل رہنے والے اور پھول مہکنے والے تھے بڈھا داؤد قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا دو ہی سال میں رخصت ہوگیا۔ لیکن اس قلیل مدت میں توصیف نے وہ زیور جمع کرلیا جو آخر وقت تک جگمگایا اور وہ پھول چنے جو مرتے وقت تک نہ مرجھائے۔

داؤد کے بعد توصیف اب گھر کی ملکہ تھی جائداد، علاقہ روپیہ پیسہ ہر چیز کی مالک اور موسیٰ کہنے کو خدائے مجازی اور حقیقتاً معمولی غلام۔

(۳)

بُرا ماننے کی بات نہیں مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں کے دور موجودہ میں دولت لامذہبی کی جڑ ہے۔ مسلمان دولتمند ہوکر نماز کا پابند کم ہی دیکھنے میں آیا ہے، غریب جس نے مفلسی میں تہجد اور اشراق تک ناغہ نہ کی مالدار ہوتے ہی مذہب کو طاق میں رکھ خدا سے ایسا فرنٹ ہوا کہ کبھی واسطہ ہی نہ تھا، اس اصول کے تحت میں موسیٰ کا اسلام روشن اور ظاہر مگر ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس نے بیوی کے نماز روزہ پر کبھی ناک بھوں نہ چڑھائی اور توصیف کی عبادت میں جو آسمان و زمین کا فرق تھا اس کی ذمہ دار وہ خود تھی یا اُس

کی دولت ۔

دریائے ہگلی کے کنارہ پر ایک عظیم الشان کوٹھی ہے جس کے چاروں طرف ایک سرسبز اور خوشنما باغ جھک رہا ہے جس میں توصیف اپنے شوہر اور چار بچوں سمیت رہتی ہے، کسی قسم کا رنج و غم اس کے پاس آکر پھٹکتا تک نہیں داؤد نے یہ کوٹھی کئی لاکھ روپے کے صرف سے ایک گاؤں میں بنوائی تھی اور دور دور کے معماروں نے اپنی صنعت کے ایسے ایسے نمونہ دکھائے تھے کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا رنگ برنگ کے پھولوں سے اس ایوان کو جنت بنا دیا تھا میلوں تک ہوا ان کی خوش بو سے مہکی رہتی تھی طائران خوش الحان کا نغمہ آبشاروں کی سُریلی آوازیں دلوں میں خواہ مخواہ اُمنگ پیدا کرتی تھیں ۔

بہتر سے بہتر زندگی جو دنیا میں کسی عورت کی بسر ہو سکتی ہے وہ توصیف کی تھی کہ موسیٰ اس کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتا اور دیکھ دیکھ کر جیتا تھا گیارہ سال کے عرصہ میں لڑائی یا جھگڑا تو در کنار کسی قسم کا اختلاف تک سننے میں نہ آیا ۔

شام کے وقت ایک روز توصیف پائیں باغ میں ٹہلتی ہوئی باہر نکلی اور سڑک پر آئی، موسیٰ ساتھ تھا دونوں میاں بیوی باتیں کرتے پاؤں پیدل دور تک نکل گئے ۔ آدمی نہ آدم زاد سرد موسم شام کا وقت مسافت خاک نہ معلوم ہوئی یہاں تک کہ دونوں ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں ایک عمارت کی ٹوٹی ہوئی دیواریں اور گری ہوئی محرابیں اس کے مسجد ہونے کا پتہ دے رہی تھیں توصیف ایک ایسی

ماں کے دودھ سے پلی اور باپ کی گود میں بڑھی تھی جہاں مفلسی نے مذہب کی وقعت رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی گو تغیر حالت نے توصیف کے خیالات میں بہت کچھ فرق کر دیا تھا، مگر اسلام کی عظمت وہ جہیز میں لیکر سسرال پہنچی تھی اسوقت یہ دیکھکر کہ خانہ خدا اس حالت میں ہو اور کتے گیدڑ اس میں رہیں دل پر ایک چوٹ سی لگی اور اُس نے مصمم قصد کر لیا کہ اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرا دوں۔

واپسی میں چند قدم کے فاصلہ پر اس نے ایک ٹوٹی سی جھونپڑی دیکھی نہ معلوم کیا دل میں آئی کہ قریب پہنچی اور دیکھا کہ ایک غریب عورت اپنے دو تین بچوں کو لئے خاموش بیٹھی ہے توصیف کو تعجب ہوا کہ اس جنگل بیابان میں یہ بچوں والی ماں کس طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہوگی۔ پوچھا:۔

"اری تو کون ہے؟ اور یہاں کیوں رہتی ہے؟"

عورت خاموش رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔

توصیف "نیک بخت جواب کیوں نہیں دیتی؟"

عورت "جی ہاں میں یہیں رہتی ہوں"

توصیف "تو اکیلی رہتی ہے؟"

اس سوال کے جواب میں کچھ ایسی داستان پوشیدہ تھی کہ عورت کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے

توصیف "رو مت حالت بیان کر"

عورت "بیوی کیا فائدہ ہوگا آپ کیوں سنتی ہیں"

اب عورت کا دل زیادہ بھر آیا تھا اس کی آنکھ سے آنسو بہ رہے تھے اور اُس کی آواز میں رقت طاری ہو چکی تھی۔

توصیف۔ بتا اپنی حالت بتا شاید میں کچھ تیری مدد کر سکوں؟

عورت "بیوی وہ سامنے گاؤں ہے اس کے پاس دو بیگہ زمین اور

ایک کنواں میرے ہے میرا شوہر کاشت کرتا تھا اور ہم یہاں سب اطمینان سے رہتے تھے مگر پارسال وہ وباہیں مرگیا زمیندار نے اس کی ورائی ٹھنڈائی بھی کی مگر نہ بچا چالیس روپیہ کا حساب اسکے مرے پیچھے زمیندار کا نکلا تھا میرے پاس وانت کریدنے کو تنکا تک نہ تھا کہاں سے دیتی اس نے میرا بچہ لے لیا اور اب مجھے اس سے ملنے بھی نہیں دیتا مجھ اسکی صورت دیکھے پانچ مہینہ ہوگئے۔ کئی دفعہ گئی۔ دھتکار دیا۔"
یہاں پہنچکر عورت کی ہچکی بندھ گئی اور اس نے توصیف کے قدموں میں گر کر کہا۔
"بیوی میرا بچہ مجھ سے ملوا دو، خدا تمہاری مامتا ٹھنڈی کرے۔"
موسیٰ "بس بیگم چلو دیکھو بالکل شام ہوگئی۔"
دونوں میاں بیوی اس عورت کی حالت پر افسوس کہتے ہوئے گھر آگئے اور صبح ہی توصیف کے حکم سے مسجد کی مرمت شروع ہوئی۔ ایک مہینہ بھر کے عرصہ میں نہایت خوبصورت مسجد تیار ہوگئی۔

(۴)

چلے کی سردی تھی اور کڑکڑاتے جاڑے وقت کی بات اور ہونی شدنی کہ توصیف کا بڑا لڑکا کلیم خاصا بھلا چنگا کھیلتا ملتا اندر آیا اور پلنگ پر لیٹتے ہی اس شدت کا بخار چڑھا کہ ماں اور باپ دونوں پریشان ہوگئے۔ ڈاکٹر حکیم یہ وہ المختصر شام تک بیسیوں آدمی جمع ہوگئے بارہ برس کا بچہ اور پہلونٹی کا دونوں میاں بیوی کا دم ہوا تھا علاج جسقدر توجہ سے ہوتا تھا اسی قدر حالت ردی ہوتی جارہی تھی تین دن اور تین رات یہی کیفیت رہی دنیا بھر کے جتن کر ڈالے مگر حالت میں کسی طرح فرق نہ ہوا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ خود ڈاکٹر بھی مایوسی کی باتیں کرنے لگے چوتھے روز جب کلیم پر بیہوشی طاری ہوئی اور توصیف کلیجہ پر گھونسے مار رہی تھی اس کو اس عورت کا خیال آیا جس کا

بچہ صرف چالیس روپیہ کے واسطے اس سے بچھڑا ہوا تھا۔

دن کے تین بجے تھے کہ عورت اپنے بچہ کی یاد میں اپنی جھونپڑی میں خاموش بیٹھی آنسو بہا رہی تھی کہ توصیف اس کے پاس پہونچی اور کہا "چلو میں زمیندار کا روپیہ دوں اور تم اپنے بچہ کو لے آؤ"

عورت پر ایک شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی وہ اچھل پڑی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"کیا آپ میرا بچھڑا ہوا کلیم مجھ سے ملوا دیں گی؟"

توصیف "کیا تمہارے بچہ کا نام بھی کلیم ہے؟"

عورت "جی ہاں"

توصیف "ہاں چلو میرے ساتھ چلو"

عورت توصیف کے ساتھ چلی مگر بت کی طرح اس کی حالت عجیب رہی۔ وہ توصیف کا منہ دیکھتی تھی بلبلاتی تھی گڑگڑاتی تھی ہاتھ جوڑتی اور کہتی تھی۔ بیگم چالیس روپیہ بہت بیسا ملے ہیں ہاتھ جوڑوں گی اور دونوں کی پانچ پانچ روپیے کے برتن تو میرے پاس ہیں یہ بیچا ہے تین روپے کا ایک ہل ہے باقی روپیہ جب تک اس میں نہ دوں آپ میرے کلیم کو اپنے پاس رکھیے میں دور سے ایک دفعہ روز صرف دیکھ جایا کروں گی۔"

توصیف اپنے بچہ کی علالت میں اس درجہ مستغرق تھی کہ اس کو دنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا وہ کسی بات کا جواب دیتی تھی نہ دیکھنے کے قابل تھی زمیندار کے گھر پر پہونچی تو توصیف کی صورت دیکھتے ہی اس کے اوسان جاتے رہے۔ اس نے روپے دیے تو کہنے لگا حضور آپ نے کیوں تکلیف کی میں وہیں حاضر ہو جاتا"

اب ایک عجیب منظر تھا زمیندار نے گھر آواز دی اور ماں کا دل جو بچہ کی محبت میں تڑپ رہا تھا بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا وہ کبھی دروازہ کو دیکھتی اور کبھی توصیف کو اس کے ہاتھ توصیف کی طرف جڑے ہوئے تھے اور زبان سے

صرف اتنا کہہ رہی تھی۔

"بیگم تیری ماما ٹھنڈی رہے"

کلیم باہر آیا ماما کی صورت دیکھتے ہی دوڑا اور اسکے گلے میں ہاتھ ڈالکر چمٹ گیا اسوقت عورت نے فرطِ مسرت میں ایک چیخ ماری اور توصیف کے قدموں میں گر گیا۔

"اے بیگم خوش رہ بچھڑا ہوا لال مجھ سے ملوا دیا"

توصیف کا دل اپنے کلیم میں پڑا ہوا تھا بھاگم بھاگ گھر آئی تو ڈاکٹر کے یہ الفاظ اس کے کان میں پہنچے "اگر بخار اس دوا سے اُتر گیا تو خیر ورنہ پھر حالت بہت خطرناک ہوگی"

برابر کے پلنگ پر خاموش لیٹ گئی رات کے دس بجے ہوں گے بچہ کا بدن دیکھا تو بدستور جلتے تھے تن رہے تھے مایوس ہوکر پھر لیٹی اور یقین ہوگیا کہ اب بخار اترنے والا نہیں۔

بارہ بجے کے قریب بخار اور تیز ہوا اور توصیف اب قطعی مایوس ہوگئی ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں لیٹی ہوئی تھی کہ آنکھ لگ گئی دیکھتی کیا ہے کہ ایک شخص سامنے کھڑا کہہ رہا ہے۔

"توصیف! خدا کا اصلی گھر تو بچھڑے ہوئے کلیم کی ماں کا دل تھا تو نے اس کی مامتا کی قدر کی تیرا بچہ تجھ کو مبارک ہو تو نے غریب کلیم کو ملوا دیا اُٹھ تو بھی اپنے کلیم سے مل"

توصیف ابھی خواب ہی دیکھ رہی تھی کہ موسیٰ کی اس آواز نے اس کو چونکا دیا "الٰہی تیرا شکر ہے بخار اُتر گیا"

گھبرا کر اُٹھی تو بچہ پسینہ میں نہا رہا تھا اور بخار کا پتہ تک نہ تھا۔

ختم

تفہیمِ عبادت

محسن حد سے زیادہ سیدھا آدمی تھا گو وہ مولوی تھا مگر آج کل کا سا نہیں۔ سچ مچ کا مولوی جس کے ذہن میں چالاکی اور عیاری کا گذر ہی نہ ہوسکتا تھا، انگریزی کے رنگ سے قطعی ناآشنا زمانہ کے حال سے بالکل بےخبر تحصیل علم سے فارغ ہوا تو دن بھر یا قرآن وحدیث کا مطالعہ تھا یا مسجد اور نماز، عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوگی لیکن ڈاڑھی اللہ کی عنایت سے ایسی گھن دار اور اتنی چوڑی چکلی اور لمبی کہ پورا جوان معلوم ہوتا تھا جس روز سے سنا تھا کہ والدین شادی کی فکر میں ہیں باغ باغ تھا گھر میں ذکر ہوتا تھا تو منہ سے خاموش رہتا لیکن جاتے جاتے کسی بہانہ سے ٹھٹک جاتا اور ہوتا اور یہ پتہ چل جاتا کہ شادی کا چرچا ہے تو بلا وجہ کوئی نہ کوئی ضرورت پیدا کر پاس جا پہنچتا برابر کی بہنیں آس پاس کی بڑی بوڑھیاں چھیڑتیں ہنسی کرتیں نو دلہن کا نام سنتے ہی باچھیں کھل جاتیں، ماں بھی دن بھر گھر کے کام دھندوں میں مصروف رہتی اور آنے جانے والوں کو بھی رات ہی کو فرصت ہوتی کوئی ساڑھے نو بجے جھگڑا ہوتا اور میاں محسن کی شادی کے متعلق تجویزیں ہوتیں اس تذکرہ کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ مولوی محسن جو عشاء کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹہ وظیفہ پڑھتے اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے مسجد سے لوٹتے پندرہ بیس روز تو مارا مار نماز پڑھ پڑھا کبھی نفل چھوڑ تے کبھی سنتیں اڑائیں دس بجے سے گھر آ پہنچتا۔ مگر جب یہ دیکھتا کہ عورتیں دس ساڑھے دس بجے ہی سے رخصت ہو جاتی ہیں تو فرض پڑھنے بھی دو بھر ہو گئے بمشکل تمام ادا کرتا، لوگ دعا مانگ رہے ہیں اور وہ جوتیاں بغل میں دبائے

گھر کی طرف سرپٹ دوڑ رہا ہے آخر خدا خدا کرکے معاملہ طے ہوا اور شادی ہوگئی اس نکاح میں محسن کے باپ نے اس کے سوا کچھ نہ دیکھا کہ لڑکی نمازی پرہیزگار اور اللہ اللہ کرنے والی ہو چنانچہ کئی لڑکیوں میں سے ایک ایسی ہی منتخب ہوئی اور کوارے محسن بیوی کے شوہر یا دلہن کے دولھا بن گئے۔

(۲)

پانچ چار مہینہ تو میاں محسن کی خوب گذری نہال نہال تھے کہ خدا کی رحمت کونے کونے سے نازل ہو رہی ہے بیوی یعنی حبیبہ عورت کیا فرشتہ ہے کہ ادھر آدھی رات تک اور ادھر دن کے دس بجے تک تسبیح درود شریف پنجسورہ غرض ہر بات میں اور ہر کام میں خدا کے سوا اور کچھ نہیں مگر چند روز بعد محسن کو اس عبادت کا پتہ لگا یہ عبادت اس کے واسطے مصیبت ہوگئی اور وہ اس طرح کہ باپ کے انتقال کے بعد مدرسہ کی جگہ اس کو ملی اور مدرسہ کا مہتمم ایسا سخت کہ دس پر دو منٹ بھی ہو جائیں تو فوراً جواب طلب میاں بیوی دس بجے جا نماز چھوڑیں مدرسہ کا وقت پورے سات گھنٹے پانچ بجے تک کا روزہ ہوگیا اور وہ روزہ جس میں ثواب کا نام تک نہیں دو چار دن تو بھوکا مرا اور اس کے بعد کہنا ہی پڑا کہ "اگر کھانے کا کچھ انتظام ہو جائے تو اچھا ہے دن بھر بھوکا رہتا ہوں"

بیوی:۔ "تو کیا میں وظیفہ چھوڑ دوں؟"

میاں:۔ "توبہ توبہ میں کفر کی بات کیوں کہوں"

بیوی:۔ "کہہ تو رہے ہو"

میاں:۔ "رات کو پڑھ لیا کرو"

بیوی:۔ "رات کا رات کو پڑھتی ہوں صبح کا صبح کو"

میاں:۔ "صبح کا بھی رات کو پڑھ لیا کرو"

بیوی:۔ "مسلمان ہوں مرنا ہے تمہارے واسطے خدا کو نہیں چھوڑ سکتی"

میاں:۔ "تو میں دن بھر بھوکا مروں"

بیوی:۔ "مرضی اللہ کی اس کے حکم سے زیادہ کچھ نہیں ہے"

میاں:۔ "پڑھنے میں کچھ کمی کر دو"

بیوی:۔ "خوب کمی کی رات کی یٰسین شریف سورہ مزمل، سورہ بقر سورہ یوسف صبح کا پنجسورہ، میں پڑھتی ہی کیا ہوں کوارپنے میں تو میں نے ایک ایک قرآن شریف روز ختم کیا ہے، اب تو کچھ بھی نہیں پڑھتی"

میاں:۔ "تو پھر تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ"

بیوی:۔ "میں تو کہتی ہوں کہ تم روز روزہ رکھ لیا کرو"

میاں:۔ "ہمت نہ ہو تو"

بیوی:۔ "خدا ہمت دے گا"

میاں:۔ "اللہ بہتر کرے"

(۳)

حالات روز بروز بڑھتے گئے ادھر میاں محسن ہفتہ میں پانچ چار مرتبہ روزہ تو نہیں، مگر روزہ کی حد کو ضرور پہونچ جاتے ضرورت تھی کہ محسن کے اماں باوا جو فرشتہ بہو کے متلاشی تھے اور اپنی دانست میں بیٹے کو دنیا ہی میں حور دیدی کچھ روز زندہ رہ کر دیکھتے کہ لڑکا فردوس بریں میں کیسی زندگی بسر کر رہا ہے مگر دونوں میں سے ایک بھی نہ رہا ورنہ باپ نہیں تو ماں زیادہ نہیں تو فاقوں سے بچالیتی یہ نہیں کہ جیسے خود کھالیتی ہو، وہ واقعی اپنے

وظیفوں کے آگے کسی چیز کی پروا نہ کرتی تھی اور اس کا یقین تھا کہ مغفرت صرف خدا کی رضا مندی ہے اور خدا کی رضا مندی نماز روزہ پر موقوف ہے ایک روز جبکہ ملیریا بخار کثرت سے پھیلا ہوا تھا دوپہر کے وقت محسن کو بھی بخار چڑھا ہانپتا کانپتا گھر پہنچا دلائی اوڑھی رضائی اور لحاف اوڑھے مگر سردی کسی طرح کم نہ ہوئی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک تھر تھر کانپتا رہا۔ تین بجے ذرا سردی کم ہوئی تو بیوی سے کہا:۔

"سر رشتہ دار صاحب کہتے تھے کہ ملیریا بخار سب کے واسطے یکساں ہے پھر کیا بات ہے کہ انگریزوں کو کم ہوتا ہے اور ہندوستانیوں کو زیادہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہندوستانی احتیاط نہیں کرتے"۔

بیوی "احتیاط سے کچھ نہیں ہوتا تقدیر میں بیماری لکھی ہے تو کون مٹا سکتا ہے ایک نہیں لاکھ احتیاط کرو"۔

میاں ۔"یہ تو صحیح ہے مگر تقدیر کے ساتھ تدبیر بھی ہے جو لوگ مسہل لے کر پیٹ کی کثافت ان دنوں میں صاف کر لیتے ہیں اور کونین کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی گھروں میں سیل نہیں ہونے دیتے کہ مچھر پیدا ہوں وہ ہرگز اس بخار میں مبتلا نہیں ہوتے"۔

بیوی "استانی بشیرن کیوں مریں؟"

میاں ۔"وہ تو موتی جھرا تھا"۔

بیوی ۔ "موتی جھرا ہو یا دق ہو دن یہی برسات کے تھے"۔

میاں ۔"اب میں کیا کروں چلا نہیں جاتا جو ڈاکٹر کے ہاں جاؤں"

بیوی "رات کو اتر جائے گا گھبراتے کیوں ہو بھادوں کا بخار شب برات کی چپاتیاں ہیں کوئی گھر خالی نہیں صبح کو حکیم کے پاس چلے جانا۔

بخار موسمی تھا صبح کو اُتر گیا تو محسن ڈاکٹر کے پاس گیا اس نے مسہل کی دوا دی، غریب نے ایک روز کی چھٹی لی اور بیوی سے کہہ دیا مجھکو بارہ بجے کھچڑی ملنی چاہیے مگر کہا اس وقت کہ بیوی اشراق کا سلام پھیر حصن حصین کا ختم شروع کر چکی تھیں ساڑھے بارہ بجے کے قریب محسن کو بھوک لگی تو دیکھتے کیا ہیں مستقل مزاج بیوی بدستور جا نماز پر بیٹھی ختم میں مصروف ہیں آج میاں کو خدا دوست بیوی کی قدر معلوم ہوئی اور جل کر کہا تو کیا اب بھی فاقہ کروں!؟

بیوی: "ہوں اوں اوں ہوں ہوں"

میاں: "بس تو تم پڑے رہے جاؤ میں سو رہتا ہوں؟"

بیوی: "اون اون ہوں ہوں ہوں"

بیوی فارغ ہوئیں تو ایک بج رہا تھا کھچڑی چڑھائی پکتے پکاتے گھنٹہ پون گھنٹہ اور لگا دو بجے میاں کھانے بیٹھے اور بیوی ظہر کی نماز کو کھڑی ہوتیں کھچڑی میں نمک پھیکا تھا مگر مانگتے کس سے اور دیتا کون دو چار منٹ [illegible] کر خود ہی اٹھے، کوٹھڑی میں گئے تو اندھیرا گھپ تھا چاروں طرف ٹٹولا، مرچیں ملیں دھنیا ملا، پیاز ملی لہسن ملا مگر نمک نہ ملا۔ بخار [illegible] مسہل، فاقہ لوٹتے تھے کہ دیوار کی ٹکر اس زور سے لگی [illegible] بجلی کوند گئی [illegible] پکڑ کر آ بیٹھے اور پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے [illegible] نماز [illegible] میاں [illegible] سے اچھا موقعہ کونسا ملتا [illegible]

[illegible] ستے اکتا جاتا

اب اس نے ذرا ہاتھ پاؤں نکالے کچھ ملنے جلنے والوں نے سمجھایا کچھ وقت نے بنایا خاموش چہرہ پہ تیوری اور کھلتے ہوئے ہونٹوں پر غصہ کے آثار نمودار ہونے لگے مگر بیوی پر نہ اس ہنسی نے اثر کیا اور نہ اس غصہ نے وہ اپنی دھن میں منہمک تھی۔ محسن ہر چند بگڑتا مگر وہ پروانہ کرتی جب نوبت یہاں تک پہونچی کہ جنت دنیا اس کے واسطے دوزخ کا فرشتہ بن گئی تو ایک روز ان حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، جن کی وہ مرید تھی اور جاکر تمام داستان سنائی، حبیبہ بھی شوہر کے یہ رنگ دیکھ رہی تھی اور جب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ شوہر کا وجود میری عبادت میں مخل ہے تو سب سے بہتر تجویز یہ ہی سمجھ میں آئی کہ وقت قریب ہے حج کو چلی جاؤں اور اگر ہجرت نہیں تو سال دو سال ہی کیو اسطے اس جھگڑے سے چھٹکارا پاؤں وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسی حالت میں کہ حقیقی چچا حج کو جا رہے ہیں اور خرچ کے واسطے اپنا زیور کافی ہے شوہر یا کوئی بھی اس کام میں خلل نہیں ڈال سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا محسن کی مجال کیا تھی کہ بیوی کے اس قصد کی مخالفت کرتا۔ دن قریب آگئے اور حبیبہ نے اپنا سامان سفر تیار کرنا شروع کیا، چچا نے آکر داماد سے دریافت کیا تو خاموشی یا بجاکے سوا اس کے پاس رکھا ہی کیا تھا وہ بھی لے جانے پر رضامند ہو گئے اور زیور شوہر کی موجودگی میں حبیبہ نے چچا کو فروخت کے واسطے دیا وہ بیچ کر لے آئے یہ جمعرات کا ذکر ہے، ہفتہ کی شام کو روانہ ہونے کا قصد تھا جمعہ کو حبیبہ بعد نماز جمعہ سب سے ملنے جلنے گئی اور رات کو میکے رہ کر ہفتہ کی صبح کو پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ پیر صاحب محسن کی زبانی مفصل کیفیت سن چکے تھے آدمی بھیجکر

اسے بھی بلا بھیجا۔ جب حبیبہ اور محسن دونوں اُن کے سامنے بیٹھے تھے انہوں نے حبیبہ سے دریافت کیا "تم نے اپنے شوہر سے اجازت لے لی؟"

حبیبہ:۔ "جی ہاں اس نیک کام سے کون مسلمان انکار کرے گا؟"

پیر جی:۔ "کیوں انکار کیوں نہ کرے گا اگر کوئی انکار نہ کرتا تو تمام دنیا ہی حج کو چلی جاتی کچھ حالات ہوتے ہیں کچھ معاملات ہوتے ہیں جب تک حالات اور معاملات اجازت نہ دیں ہر شخص مخالف رائے دینے کا حق رکھتا ہے اور اگر یہ اس لئے کہ تمہارے شوہر ہیں بخوشی تمام تم کو اجازت نہ دیں تو تمہارا حج میری رائے میں حج نہیں ہو سکتا۔"

حبیبہ:۔ "ان کو ظاہر ہے کہ تکلیف ہوگی۔"

پیر جی:۔ "جب تم یہ جانتی ہو پھر کس طرح حج کا قصد کرتی ہو تم نے ابھی مسلمانوں کے خدا کو پہچانا نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کا خدا اور ہے بلکہ یہ کہ اسلام کے اصول تم سمجھ نہ سکیں اسلام میں جس قدر خدا کے تعلقات رکھے گئے ہیں وہ محض دنیوی زندگی کی فلاح و بہبود کے واسطے نہ کہ اس طرح کہ ایک آدمی دنیا کو چھوڑ چھاڑ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ اللہ اللہ کرتا مر جائے۔ تم بہ حیثیت بیوی کے ان کی فرمانبردار ہو اور یہ بہ حیثیت شوہر کے تمہارے غمخوار اور مشیر کار۔ ان کا فرض ہے کہ تم کو خوش رکھیں اور تمہارا کام ہے کہ ان کو رضامند کرو یہ ہی اصلی حج ہے۔ اگر تم ان کو رضامند کر مریں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا حج ہو گیا۔ تم کو معلوم نہیں کہ صرف فرائض کے واسطے البتہ حکم نہیں ورنہ نماز تک شوہر کے حکم سے توڑ دینے کی اجازت دی ہے۔ میں تو سنتا ہوں کہ دن رات وظیفے اور چلوں میں ایسی گھسی ہو کہ گھر کے کام کاج تک کی پروا نہیں یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ

کھانے کی بھی پروا نہیں کرتیں۔ شوہر فاقہ سے ہو تو ہو مگر تمہارے چلہ اور وظیفہ میں فرق نہ آئے یہ تو جنت کے نہیں دوزخ کے سامان ہیں تم نے شوہر کی زندگی برباد کردی اور توقع یہ رکھتی ہو کہ خدا کی رضامندی حاصل کروں۔ تم اسلام کو بدنام کرتی ہو اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری مثال دوسروں کے واسطے نہایت مضر اور تکلیف دہ ہے۔ تم اسلام کو نقصان پہنچا کر گنہگار ہو رہی ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ ایک شخص جو شب و روز عبادت کرتا تھا اس سے سرور دو عالمؐ نے صاف فرمایا کہ وہ کرو جو میں کرتا ہوں یعنی دنیا کی ضرورتیں بھی پوری کرو اور دین کی بھی کیا خود حضور اکرمؐ یا آپ کے احباب و تابعین نے دن رات خدا کی عبادت کی اور دنیا سے قطع تعلق کر لیا، کیا خدا اور اس کے رسولؐ کا ایسا حکم کہیں موجود ہے؟ تمہاری جنت تمہاری عبادت تو صرف یہ ہے کہ محسن تم سے راضی اور تم اس سے خوش ہیں فتویٰ دیتا ہوں کہ تمہارا یہ حج ہرگز قبول نہیں ہو سکتا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس وقت حالات اجازت دیں گے موقعہ اور محل ہو گا خود محسن اس فرض کو ترک کرنے والے نہیں دونوں میاں بیوی جانا اور ہنسی خوشی اپنا فرض ادا کرنا۔"

(۵)

پیر صاحب کی نصیحت حبیبہ کے دل میں گڑ تو گئی مگر ایک عمر کی پڑی ہوئی عادت آسانی سے چھٹنی محال تھی اس نے رفتہ رفتہ اپنے وظائف میں کمی کی۔ اور سال بھر کے اندر ہی اندر یہ کیفیت ہوئی کہ فرائض کے بعد وہ سب سے مقدم محسن کی خدمت سمجھتی تھی اور اس سے فارغ ہو کر جتنا وقت بچتا تھا وہ عبادت میں صرف کرتی تھی اور اس پر

محسن کو بھی کسی قسم کا اعتراض نہ تھا اور وہ خوش تھا کہ بیوی کی اپنی خواہش بھی پوری ہو رہی ہے اور اس کو بھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو رہی محسن غریب فقیر نہ تھا خاصا اوسط درجہ کا آدمی تھا مگر جبتک بیوی وظیفوں میں مصروف رہیں گھر کی خاک اڑ رہی تھی بریانی اور تنجن بھی ہوتا تھا تو دال اور چٹنی سے بدتر محسن پانی کیواسطے بیٹھا ہے حلق میں نوالہ اٹک رہا ہے اور بیوی تسبیح میں مصروف اب اس تغیر نے محسن ہی کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ نہیں کیا۔ بلکہ خود حبیبہ کو بھی معلوم ہو گیا کہ میں جو کچھ کر رہی تھی وہ نادرست تھا اور مسلمان عورت کا کام یہ ہی نہیں ہے کہ وہ محض نماز روزہ کرلے اور دنیا کی تمام ضرورتوں سے بیفکر ہو جائے۔ ایک روز جب چھٹی کے دن پانی زور شور سے پڑ رہا تھا۔ حبیبہ کہنے لگی "دس بج گئے پانی تو تھمتا نہیں پکنے کا کیا کروں"

محسن "میں تو سمجھوں بیسن موجود ہے بیسنی روٹی پکالو ماما بھی آج نہیں آئی"

حبیبہ نے اٹھکر آٹا گوندھا اور روٹی پکاکر آگے رکھی دو آدمیوں کا پکنا ہی کیا ڈیڑھ پاؤ آٹا کافی تھا تو بیوی سے کہا کہ "اب تو فارغ ہو گئیں اچار لیکر یہاں آجاؤ ساتھ ہی کھالیں"۔

حبیبہ اور محسن دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ اتفاق سے پیر صاحب بھی آگئے۔ ہر چند حبیبہ اٹھنے لگی مگر انہوں نے نہ مانا اور کہا "دونوں کھانا کھالو" اس وقت دستر خوان پر بیسنی روٹی آم کا اچار اور لہسن کی چٹنی تھی پیر جی نے فرمایا "میں صبح کا یہاں آیا ہوا تھا مینہہ تھمتا نہیں خیال آیا کہ تمہارے پاس بھی ہوتا چلوں مجھے اس وقت بہت ہی خوشی ہوئی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ چٹنی روٹی جو تم دونوں میاں بیوی مل کر کھا رہے ہو بریانی تنجن سے ہزار درجہ بہتر ہو اور بی حبیبہ تمہاری اس عبادت سے یہ حالت افضل اور بیشک خدا کی رضامندی ہے"

نئی دلھن

ہوا نے سکوت شب کو توڑا گو اندھیرا تمام سڑک پر بدستور چھایا ہوا تھا مگر بجلی کی چمک میں سلطانہ یہ دیکھ رہی تھی کہ نیم اور شیشم کی سرسبز پتیاں جواب تک خاموش تھیں اب جھوم جھوم کر آپس میں گلے مل رہی ہیں۔

بادل شدّت سے کڑک رہا تھا اور اس کی دہشت نے فرحت کو اذیت سے تبدیل کر دیا تھا، دریا جس کی لہریں سلطانہ کے دل پر ایک خاص کیفیّت پیدا کرتی تھیں آنکھوں کے سامنے ضرور تھا مگر اس کے چہرے پر درختوں کی چھوٹی چھوٹی پتّیاں جن کا سایہ ہمیشہ دریا دلی سے اپنے مہمانوں کا استقبال کرتا رہا اس وقت سلطانہ اور جعفر دونوں کی باتوں پہ قہقہے لگا رہی تھیں۔

پھیلے ہوئے بادل سمٹ سمٹا کر سیاہ گھٹا بن گئے، کڑک تیز ہوئی اور بجلی کی چمک نے دونوں میاں بیوی کے دل دہلانے شروع کئے، جعفر چاروں طرف سے سلطانہ کو چھپائے ہوئے تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اس کا خوف ترقی نہ کرے، مگر بادل کی ایک آواز اس کی تمام کوششوں کو بیکار کر دیتی تھی سلطانہ لرز جاتی تھی اس کا نازک دل بلیوں اُچھل رہا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جعفر کے کلیجہ میں گھس کر بجلی اور بادل دونوں کو آنکھ سے اوجھل کر دوں۔

سلطانہ بالکل خاموش اور پریشان تھی مگر جعفر کے دل میں جس قدر خوف تھا اس سے بہت زیادہ ہنسی اس کے ہونٹوں پر لوٹ رہی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں چھپائے ہوئے آگے بڑھ اور بڑھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ بجلی اُس کے قدموں میں تڑپنے لگی۔

اب البتہ اس نے جعفر کی ہمت پست کر دی اور اس کو یقین ہو گیا کہ بجلی آج کچھ نہ کچھ گل کھلائے گی، اس نے کھسیانی ہنسی سے کہا۔ "بیگم میں تو تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آج آسمان کا رنگ ٹھیک نہیں باہر نکلنا خلاف مصلحت ہے مگر ہوا خوری نے ایسا تمہارا پیچھا پکڑا ہے کہ نمازی بی نماز قضا ہو جائے مگر تمہاری سیر ناغہ نہ ہو"

سلطانہ "خدا کا واسطہ اس وقت تم میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو اور کسی طرح گھر پہونچو"

جعفر "گھر کچھ نہیں تو یہاں سے دو میل ہوگا مجھے تو اُمید نہیں کہ صحیح سلامت گھر پہونچ سکیں۔ دیکھتی ہو بجلی کیا غضب ڈھا رہی ہے برسات نہیں پہاڑ میں ہیں اس موقعہ پر تو بجلی زیادہ گرتی ہے۔

سلطانہ "قصور، خطا، غفلت میری ہی سہی مگر اسوقت تو رحم کرو"

جعفر۔ تمہاری نادانی حماقت صرف میری ہی ہے کہ دور اندیشی سے کام نہ لیا اور تم جیسی کوتاہ اندیش کی ترغیب میں آکر اپنی جان خطرہ میں ڈال لی۔ اس روز محض تمہارے اصرار پر تم کو تھیٹر جانے کی اجازت دی باوجودیکہ مجھے فرصت نہ تھی تم نے جانا ضروری سمجھا، نتیجہ دیکھ لیا کہ بڑھیا زخمی، گاڑی چکنا چور اور گھوڑی جان سے گئی آج یہ مزا چکھا"

اتنا سُن کر سلطانہ جعفر کا ہاتھ جھٹک دور جا کھڑی ہوئی اور کہا۔

"میرا منہ کالا کرو تم شوق سے گھر پہونچ جاؤ اور مجھکو یہیں چھوڑ دو زندگی ہے تو پہونچ جاؤں گی ورنہ مرجاؤں گی"۔

(۲)

گرمی کی چلچلاتی دہوپ میں شعبانہ چولھے کے پاس بیٹھی ماما سے سالن بگھروا رہی ہے اور اصغر شعبانہ کا شوہر کسی کتاب میں مصروف ہے ہوا بند ہے اور گھمس نے پسینہ کی ندیاں بہادی ہیں رات سے شعبانہ کو خفیف حرارت تھی چونکہ آج اتوار چھٹی کا روز تھا اور اصغر کو کچہری جانا نہ تھا اس لئے شعبانہ بے فکر بیٹھی رہی۔ مگر جب گیارہ بج چکے اور کھانا نہ پک سکا تو باورچی خانہ میں گئی کہ مارا مار اخود کھانا تیار کرے، صغیرہ تو دو ہی برس کی تھی مگر ایسی ضدی کہ ماں نے ہر چند سمجھایا باپ نے بہتیری آوازیں دیں۔ پسینہ میں شرابور ہے، مگر چولھے کے پاس سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔

اس بلبل گرفتار کی طرح جو اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار قفس کے چکروں سے کرتی ہو شعبانہ اصغر کی فوقیت اور اپنی ندامت کا اعتراف خاموشی سے کر رہی ہے ڈرتی ہے کہ عنقریب میری غفلت کی بازپرس نہ ہو جائے اور کوشش کر رہی ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہو کھانا تیار کر کے آگے رکھدوں۔

ایک بجنے میں بائیس منٹ تھے کہ اصغر نے جمائی لی کتاب کو الگ کیا اور کہا کیا غضب ہے ایک بج رہا ہے کھانا ابتک تیار نہیں تمہارے ہاتھوں میری جان تو مصیبت میں پھنس گئی "

شعبانہ۔ "دیر تو واقعی ہوگئی میں اتوار کے خیال میں رہی، اب ہوا جاتا ہے ابھی لائی۔"

اصغر۔ "کیا خاک ہوا جاتا ہے بس معاف کرو آج شام سے اپنے کھانے کا کچھ اور انتظام کرلوں گا۔ میرا کھانا اب نہ پکانا۔"

اتنا کہہ کر اصغر کھڑا ہوا اور باہر جا لیٹا۔

(۴)

جعفر۔ "کیوں بیگم کل کے جلسہ میں شعبانہ تو نہ آئی ہوگی۔"

سلطانہ۔ نہیں آپ نے سنا نہیں ۱۰ ر تاریخ کے جلسہ میں ان عورتوں نے کیا مصیبت ڈھائی اچھی طرح معلوم تھا کہ رانی صاحبہ صدر ہیں مگر کمبختیں دو دو تین تین برس کے چھیچھڑوں کو لیکر جلسہ میں آپہونچیں اور پھر ایا نہ وا یا وہ چیخم دھاڑ مچائی کہ بیچاری رانی صاحبہ کو دو لمحہ بیٹھنا وبال ہوگیا۔ مجبوراً اب اعلان کرنا پڑا کہ کوئی بیوی بچوں کو لے کر جلسہ میں نہ آئیں، شعبانہ میری بہن ہے تو ہوا کرے مگر دیکھ لو بغیر بچی کے نہ آسکی ان کمبخت ماؤں کی عقل پر نہ معلوم کیا پتھر پڑے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوا، اور دنیا تج دی۔"

جعفر۔ "خیر تم اس مصیبت سے محفوظ ہو۔"

سلطانہ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہے ہے نہ کہیے کہیے، اپنی نیند سونا اپنی نیند اُٹھنا اس روز اتنا غصہ ان بچے والیوں پر آیا ہے کہ میرا بس چلتا تو سب کو مروا ڈالتی۔"

"بیگم آج تو تم وہ کاسنی۔ بلاؤس اور بنارسی ساری نکالو۔"

سلطانہ۔ مجھے تو اس سے نفرت ہوگئی سلک کی نئی ساری اور

قمیص پہنواں گی"۔

(۴)

"ایک دفعہ نہیں میں نے بارہا تم سے کہا کہ تم روزانہ لباس تبدیل کیا کرو مگر نہ معلوم کس قسم کی طبیعت لے کر آئی ہو کہ اثر نہیں ہوتا اتنے میلے کپڑے دیکھنے والے کا بھی جی متلائے! کیا تم سمجھتی ہو کہ بیوی کا فرض محض خدمت سے ادا ہوتا ہے، میں انسان ہوں فرشتہ نہیں ہوں کہ صرف تمہاری اطاعت ہی پر ریجھوں گا خواہ صورت زہر ہی معلوم ہو"۔

"شعبانہ نہانے کو جا رہی تھی اصغر اُٹھ بیٹھا چھوڑ دیتی تو اور آفت مچا دیتا، اسلیئے پہلے اس کو دودھ پلا رہی ہوں ابھی سو جائے تو کپڑے بدل لوں"۔

اصغر:"اطہر یا اظہر میری زندگی کے واسطے مفید ثابت ہونے چاہئیں نہ کہ مضر تمہاری حالت روز بروز ابتر ہو رہی ہے زیور تو نصیبہ کی زندگی نے ختم کر دیا اب لباس اظہر کی نذر ہوا کوئی افسر پیدا ہو جائیں گے تو شاید منہ دھونا بھی چھوڑ دوگی، اولاد میاں بیوی کی محبت میں ترقی کا سبب ہونا چاہیئے نہ کہ تنزل کا اگر تم کو ناگوار نہ ہو تو میں کہوں گا کہ میں اُلٹا اثر دیکھ رہا ہوں"۔

شعبانہ:"یہ میری تقدیر ہے مگر میں کہہ سکتی ہوں کہ عورت بغیر اولاد کے وہ درخت ہے جو ثمر سے اور وہ پھول ہے جو خوشبو سے محروم ہے بچے بظاہر میاں بیوی کی محبت کو کمزور کرتے معلوم ہوں مگر وہ اندر ہی اندر اس محبت کو ترقی دینے والے ہیں تم آج اس سے

اتفاق نہ کرو مگر کل تم کو ماننا پڑے گا کہ بچے ہی وہ زنجیریں ہیں کہ ماں باپ کی نفرت میں ان کے پاؤں میں زنجیر بن کر ان کی علیحدگی کو روک سکتے ہیں"۔

اصغر۔ "تمہارا خیال قطعاً غلط ہے میں مدت سے دوسرے نکاح کی فکر میں ہوں کیونکہ دیکھتا ہوں کہ تم ہر وقت ان کی پرورش میں منہمک ہو اور میری آسائش کی طرف توجہ نہیں کرتیں اس کا نتیجہ تم عنقریب دیکھ لوگی"۔

شعبانہ۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کوشش میں ناکام ہوئی میں نے بچوں کی پرورش سے زیادہ تمہاری آسائش کو مقدم سمجھا آیندہ اور زیادہ احتیاط کروں گی۔ اور اگر تم نکاح پر آمادہ ہو تو میں منع نہیں کرتی۔ بسم اللہ"

اصغر "صغیرہ کہاں چلی گئی، میں نے تم کو کئی دفعہ منع کیا کہ باہر نہ نکلنے دیا کرو، کہیں کھو کھوائی جائے گی تو اور مصیبت آئے گی"

شعبانہ "دیکھتے ہو دم بھر نہیں ٹکتی کہاں تک ٹانکہ سے ٹانکا لگائے بیٹھی رہوں"

اصغر۔ بس تم تو ایک بات کہہ کر چھوٹ گئیں اب ڈھونڈھنا مجھ کو پڑا۔ دیکھو کتنا مارتا ہوں۔

(۴)

"قریب قریب تمام دوستوں اور عزیزوں کی یہی رائے ہے"

سلطانہ "چولھے میں گئے وہ عزیز اور بھاڑ میں وہ دوست جو کمبخت یہ ترغیب دیں کہ تم اس کی جو عمر بھر کی شریک ہے اس کی جس سے

زیادہ تمہارا عزیز اور دوست نہیں ہو سکتا اس کی جو اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں کو چھوڑ کر تمہارے گھر پر آئی زندگی برباد کرو اور سوکن لا کر اس کو زندہ درگور کرو۔"

جعفر۔ "میں خود اس رائے سے متفق نہیں ہوں، مگر ابا جان اور اماں جان دونوں اس پر اڑے ہیں کہ خاندان میرے بعد ختم ہوتا ہے۔"

سلطانہ۔ "آگ لگے خاندان کو کیا تم بچہ ہو کہ وہ زبردستی تمہارا نکاح کردیں گے اور ایسا گناہ کروائیں گے جس کی قطعی مغفرت نہیں، سمجھتے ہو کہ میں اس وقت زندہ رہوں گی ہرگز نہیں، اپنے نکاح سے پہلے میری موت کی خبر سن لینا۔ مجھ سے تو شعبانہ ہی خوش نصیب ہے باوجودیکہ میاں شاکی ہے اور خوش نہیں مگر ایسی روحانی اذیت نہیں دیتا۔"

جعفر۔ "تم کو خبر ہی کیا خاک ہے اس کا نکاح تو سعیدی سے ٹھہر گیا"

سلطانہ۔ "مجھے تم سے زیادہ خبر ہے کیا بیٹیوں کا ملنا گڑیوں کا کھیل ہے۔ اس کے باپ نے صاف انکار کردیا کہ دو بچوں پر کون بیٹی دے"۔

جعفر۔ "اس کا نکاح یقیناً حماقت ہے، جب اولاد موجود ہو تو نکاح کی وجہ کیا اور ضرورت کیوں۔"

سلطانہ۔ "تو کیا جن کے ہاں اولاد نہیں وہ نکاح ضرور کریں، اولاد نہ ہوئی خدا کی دیدار ہو گئی۔"

جعفر۔ "بیگم میں تو نہیں کہتا میں تو اسی طرح تمہارا قدردان ہوں جیسا پہلے تھا۔ یہ لوگوں کا خیال ہے جو میں نے ظاہر کیا۔

(۵)

"تم میرے حقیقی بہنوئی ہو اور اس لئے کہ ابا جان یہ کہتے ہیں کہ نکاح کے انتخاب میں تم نے اپنی مرضی مقدم سمجھی اب تم خود نتیجہ کی ذمہ دار ہو۔ تمہارے سوا میرا رفیق کون ہے تم آج ہی میرے مہر کا دعوی کر دو۔

اصغر: "مگر تمہارا مہر معجل تو نہیں ہے دعوی کس بات کا۔"

سلطانہ: تو کیا میرا کوئی حق نہیں اور اس ظالم کو اختیار رہے کہ جو چاہا کیا اور جو چاہے کرے!"

اصغر: "تمہارا حق کیوں نہیں جو پہلے تھا وہ اب ہے تم جاؤ اور اس گھر میں رہو کس کی مجال ہے کہ تمہاری عزت اور اختیارات میں فرق آنے دے!"

سلطانہ: "اس گھر میں سوکن ہے اور میں جاؤں؟ ناممکن! ہرگز نہیں۔ بہتر ہے کہ میں اس اذیت کو برداشت کروں۔

اصغر: "اگر یہ اذیت ہے تو امہات المومنین نے جو ہماری مائیں ہیں کس طرح برداشت کیا؟"

سلطانہ: "خیر مجھے اس سے بحث نہیں جعفر کا یہ فعل ایسی سنگدلی ہے کہ الامان الحفیظ!"

اصغر: "میں اس کو سنگدلی نہیں سمجھتا میں خود دوسرا نکاح کر رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر اصغر باہر گیا گرمی کا موسم تھا پانچ بج چکے تھے نہایا کپڑے بدلے اور روپیہ نقد جو چڑھاوے کے واسطے مقرر ہوا تھا صندوقچہ سے نکالا اور نوٹ جیب میں رکھے بید ہاتھ میں لی بوٹ پہنا اور آگے بڑھا۔

دروازہ کے قریب تھا اور نئی امنگیں دل باغ باغ کر رہی تھیں

کہ پیچھے سے صغیرہ ٹانگوں میں آکر لپٹ گئی اور کہنے لگی "

" ابّا جان کہاں جاتے ہو "

اسوقت اصغر کے سامنے ایک دوسرا منظر تھا۔ چھوٹی سی صغیرہ جو اسوقت مینا کی طرح بول رہی تھی جوان بن کر عالم خیال میں اس کے سامنے آئی اور دل نے صدا دی کہ میں آج نکاح کا مجاز ہوں کوئی طاقت مجھ کو روک نہیں سکتی۔ لیکن اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کل میری بچی کے ساتھ اگر یہی سلوک ہوا تو اس کے دل پر کیا گذرے گی۔ شعبانہ کا قصور صرف یہ ہے کہ بچوں میں منہمک رہتی ہے۔ بچے کس کے یہ بھی تو میرے ہی ہیں اگر شعبانہ مرجائے تو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ایسی خدمت گذار میسّر نہیں آسکتی۔

یہ خیال آتے ہی اصغر کا دل بھر آیا۔ اس نے صغیرہ کو جو اس کی ٹانگوں سے جمٹی ہوئی تھی یہ کہہ کر گود میں اُٹھالیا۔

" میری نئی دُلہن تو یہ ہے "

اصغر نے اس کے رخسار کو بوسہ دیا گھر میں لایا اور بیوی سے کہا۔ "

" لو میری نئی دُلہن یہ آئی "

سنہ ۱۹ء

میں نے کیا دیکھا

کل میرے پوتے امین کے بچہ کا عقیقہ تھا جب تمام مہمان جمع ہو گئے تو بچوں کو یہ خبط اچھلا کہ دادی اماں کی تصویر اتاری جائے مجھ سے آن کر کہا۔ تو میں نے ایک سرے سے سب کو جھڑک دیا مگر ضدی بچے کیا مانتے والے تھے اس تعلاج میں ماؤں کو شریک کیا اور ان نیک بختوں نے اپنے اپنے شوہروں کو بھی راضی کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو بھی ماننا پڑا اور تصویر اترنی شروع ہوئی۔ بیچ میں میں بیٹھی۔ دائیں بائیں بہو میں ان کے پیچھے ان کے شوہر اور ان سے ذرا بلندی پر ان کے بچے اس قطار میں بچوں پچ۔ میاں امین اپنے بچہ کو لئے ہوئے، اس تصویر کی غرض تو صرف یہی کہ میں نہایت خوش نصیب عورت ہوں جس کے اندر رکھے اتنی سارے بچے آنکھوں کے سامنے موجود ہیں تصویر اتر گئی اور سب نے ایک ایک کر کے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ایمان کی بات یہ ہے بیحد خوش تھی خدا نے مجھ کو یہ دن دکھایا میری عمر اس وقت ایک سو دس برس کی تھی مگر جب مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں کیا کیا کام کئے اور کیا کیا دیکھا تو ایک سناٹا سا آ گیا۔ میں خاموش اپنے دالان میں چلی آئی۔ افسوس صد افسوس میں نے کوئی کام بھی ایسا نہ کیا تھا جس کو آج فخر سے بیان کروں البتہ بہوؤں پر ظلم میں نے کئے ایک کو طلاق تک دلوائی کہنے والوں کو ذلیل میں نے کیا اور رانڈ بھاوجوں سے ماماؤں کا کام میں نے لیا غرض کہنے میں تو میں بدترین عورت تھی۔ ہاں دیکھنے میں دو واقعے دیکھے جو مدتیں گزر جانے پر بھی میری آنکھ کے سامنے تھے۔

میں نے پچوں کی ان ہی دیوار بیچ رسالدار صاحب رہتے تھے ان کی بیوی کبھی تمہاری پرہیزگار کہ اللہ سب لڑکیوں کو ایسا کرے۔ ان کی ماما کی نواسی ایک لڑکی تنکو بنے

تھی جس کو وہ اپنے بچوں سے زیادہ اسلئے چاہتی تھیں کہ یہ ماں باپ کی بچی تھی۔
جب رسالدار صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی آمدنی برائے نام رہ گئی پھر بھی انہوں
نے اس لڑکی کو اس طرح بیاہا کہ ایک میں کیا سارا شہر تعجب کرتا تھا۔ خدا کی شان
ایک وقت ایسا آیا کہ ان کی بیوی کے پاس دانت کریدنے کو تنکا تک نہ رہا۔ آن
بان کی عورت تھیں، تمام تکلیفیں گوارا کیں مگر گھر کی ہوا نہ بگڑنے دی خدا بخشے
رسالدار صاحب کی زندگی کا کیا کچھ جھگڑا اٹھایا بعد کا ایک بنئے نے اٹھارہ روپیہ
کی نالش کی اور محلہ بھر میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قرقی لے کر آیا ہے بیٹا بھی گئی۔
دہاڑوں رو رہی تھی میں نے کہا آپ کی کنیز شکوران کا خاوند ڈیڑھ سو روپیہ کا داروغہ جیل
ہے اس کو اطلاع دیجئے اٹھارہ روپیہ کی رقم ایسی نہیں ہے کہ وہ نہ دے سکے آپ
ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ وہ آج بیگم بنی بیٹھی ہے۔ فرمانے لگیں کہ خیر مگر جب سے
ساتھ ہمیشہ سلوک کیا اب اس کے آگے ہاتھ پھیلانے کو جی نہیں چاہتا۔ میرے
زیادہ اصرار سے بمشکل رضامند ہوئیں اور میں ان کو ڈولی میں بٹھا کر شکوران کے
گھر لے چلی۔

موسم گرم تھا دوپہر کی تپ چھوٹ چلی تھی مگر ہم مصیبت کے مارے
اس حالت میں وہاں پہنچے ڈولی سے اتر کر کوٹھی کے برآمدے میں ٹھہرے ہوئے
ہماری اطلاع ہوئی اور ایک ماما نے آکر کہا بیگم صاحبہ رسالدارنی کو سلام
کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ ٹھہریئے میں چار بجے کے بعد آپ سے مل سکوں گی۔
ماما یہ کہہ کر چلی گئی بیساکھ کی قیامت خیز دھوپ ہمارے سر پر تھی کہار
مزدوری کے واسطے ہم کو برا بھلا کہہ رہے تھے رسالدارنی واپسی کا تقاضا
کر رہی تھیں، مگر میں ان کو سمجھا بجھا کر ٹھہرا رہی تھی۔
مجھ پر تمام عمر ایسی مصیبت کبھی نہ گذری ہوگی جو گھڑیاں ہمارے سر پڑتی

خدا خدا کر کے چار بجے مگر کیسے چار اور کس کے پانچ چھ بجے کے قریب جب میں نے دوبارہ اطلاع کروائی ہے تو ہم کو اندر آنیکی اجازت ملی شکورن سر سے پاؤں تک سونے میں ٹوٹ رہی تھی میں نے اُس سے اٹھارہ روپے کی التجا کی جس کو سن کر اُس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا بیشک میرا بچپن رسالدارنی کے پاس گزرا ممکن ہے اُنہوں نے میری خدمت بھی کی ہو لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ان کو اٹھارہ روپے مفت دیدوں اچھا میں جاتی ہوں آپ مجکو پھر یاد دلا دیجئے گا۔

یہ ایسا نازک وقت تھا کہ میں شکورن کو دیکھکر دم بخود رہ گئی اسی شام کو رسالدار صاحب کے مکان پر قرقی آئی اور تھوڑی دیر کے بعد ہم نے سنا کہ اسباب قرق ہونے سے پہلے رسالدارنی افیون کھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

آج رسالدارنی اور شکورن دونوں گذر چکے ہیں، مگر میں نے یہ وہ واقعہ دیکھا کہ اب بھی جب کبھی خیال آتا ہے اور شکورن کی صورت نظر آتی ہے تو میں بید کی طرح کانپ جاتی ہوں امیری میں نخوت اور غرور کی ایسی مثال اور احسان فراموشی کی ایسی نظیر شاید دوسری نہ ملے۔

دوسری مثال مفلسی کی ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے جب سردار ابن علی صاحب کا انتقال ہو گیا تو ان کی جائداد قرضہ کو کافی نہ ہو سکی۔ بیگم بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی میرے سامنے چھوٹی سے بڑی ہوئی امیری اس کی ہر بات سے ٹپکتی تھی اور غربا پروری جو امارت کا اصلی جوہر ہے اس کا خاص شیوہ تھا، زمانہ نے اس کو یہ وقت دکھایا کہ محلوں میں بسر کرنیوالی بیگم ایک ٹوٹے سے مکان میں ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر آ کر رہی دو برس کی بچی گود میں تھی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کبھی لالہ کی ٹوپیاں سیتی اور کبھی درزی کے کرتے۔ بدنصیب بیگم کے بنے ہوئے زمانہ کی ایک نہ معلوم انا تھی یا کھلائی، رحمت نامی عورت ہر وقت ساتھ لپٹی رہتی تھی۔ اس عید سے ایک روز قبل

کا ذکر ہے کہ صبح ہی صبح ہم نے بیگم کے دروازہ پر غل غپاڑے کی آواز سنی۔ میں کوٹھے پر چڑھی دیکھتی کیا ہوں کہ رحمت کے دوست مشٹنڈے لڑکے باہر کھڑے ہیں۔ بیگم جانماز پر خاموش بیٹھی تھی اور رحمت للکار للکار کر کہہ رہی تھی کہ چاہے تم بھیک مانگو چوری کرو، برتن بھانڈا بیچو مگر میرے ساڑھے نو روپے اس وقت دھر دو۔ میں نیچے اتری پردا کروا کر اندر گئی اور کہا کیا معاملہ ہے۔

بیگم "کیا عرض کروں میں نے تو ان سے کبھی قرض نہیں لیا جو خدا دیتا ہے ان کی خدمت کر دیتی ہوں اب یہ فرماتی ہیں کہ میرے ساڑھے نو روپے ابھی دو نہیں تو میں اپنے مردوں کو بلا کر یہ سب چیزیں اٹھوا لوں گی۔"

رحمت "ہاں سچ ہے تم کیوں لینے لگیں تمہارے باوا آ کر یہ خرچ اٹھاتے ہوں گے تمہاری آمدنی کیا ہے دنیا بھر سے قرض لائی اور تم دونوں ماں بیٹیوں کا پیٹ پالا۔ اب میں جھوٹی اور میرے باپ دادا جھوٹے کل شام کو وعدہ تھا۔ میرے بچوں کی عید اپنا مونہہ ہی دو سیدھی طرح دیتی ہو تو دو نہیں تو وہ آپ گھس کر لے لیں گے۔"

بیگم "مجھے تو تمہارا ایک پیسہ بھی دینا نہیں ہے نہ میں نے کوئی وعدہ کیا۔ میرے پاس یہ دو برتن ہیں ایک پتیلی اور پانی پینے کا کٹورا تم شوق سے لیجاؤ۔"

رحمت "یہ دو برتن تو آٹھ آنے کے بھی نہیں ہاں یہ بچی کے پاؤں میں چاندی کی چوڑیاں بھی تو ہیں وہ دیدو"

میں "بوا رحمت تم قسم کھا سکتی ہو کہ تمہارے روپے بیگم پر چاہئیں۔"

رحمت۔ سو دفعہ، مسجد میں رکھدو، قرآن پر رکھدو، دیکھو اٹھا لیتی ہوں یا نہیں، قرضہ نہ سہی تنخواہ سہی میں جو ان کے ہاں روز سوتی تھی تو کیا مفت سوتی تھی، ان کے باوا دادا کی نوکر تھی۔"

اتنا کہہ کر ظالم عورت نے بیگم کی بچی کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور بلکتی ہوئی بچی

کی چوڑیاں اُتاریں ہر چند بیگم نے ہاتھ جوڑے اور میں نے خوشامد کی مگر وہ سنگ دل نہ پسیجی اور چوڑیاں لیکر چلتی ہوئی میں بھی اس کے بعد تھوڑی دیر بیگم کے پاس بیٹھی اس کی آنکھ سے کسی طرح آنسو نہ تھمتا تھا دنیا کا جو دستور ہے اس کے موافق میں بھی سمجھا بجھا کر اپنے گھر گئی شام کے وقت جب میں بیٹیا بیٹیوں بہوؤں اور دامادوں کے سلام سے فارغ ہوگئی تو بیگم کے پہنچی۔

جاڑوں کے دن تھے اور ململ کے اکہرے دوپٹہ میں بیگم اپنی بخار زدہ بچی کو لئے اندھیرے گھپ میں بیٹھی سکڑ رہی تھی میری آواز سنتے ہی بچی دوڑی ہوئی آئی پاؤں سے لپٹ گئی اور کہنے لگی۔

"اچھی اماں میری چوڑیاں دیدو"

بچی کا کہنا میرے کلیجہ میں تیر کی طرح گھس گیا میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا تو بخار میں پھنک رہی تھی میں اس معصوم کو گود میں لئے ہوئے اپنے گھر آئی لالٹین لے کر بیگم کے یہاں پہنچی تو وہ عصمت کی دیوی حسرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ برس کا برس دن تھا اور یہ قدرت کا بہترین نمونہ جس کی عمر اکیس بائیس برس سے زیادہ نہ ہوگی خودغرض مردوں کی جان کو ہوگی کے آنسوؤں سے رو رہی تھی معصوم بچی رو رو کر بخار میں اچھل رہی تھی اور اپنی چوڑیوں کو یاد کر رہی تھی۔

اس بچی پر جو کچھ ستم ایک ظالم عورت کے ہاتھ سے ٹوٹے میں مرنے کے بعد بھی اس کو نہ بھولوں گی۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ میری عمر کے یہ دونوں واقعے عورت کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیسا مبارک ہوگا وہ وقت جب ہم میں وہ عورتیں پیدا ہوں گی جو احسان فراموشی کی جانی دشمن اور اپنی بہنوں کی سچی خدمت گذار ہوں گی۔

سنہ ۱۴ء

دولھن دونوں کی

" بانو یہ تم ابھی کہہ چکی ہو کہ مملکتِ عشق میں جہاں گیر کا نام بقائے دوام کے پھولوں سے آراستہ ہے۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اقلیم عدل میں بھی اس کی ہستی ایسے موتی لٹا گئی ہے جو قیامت تک ماندنہ ہوں گے۔ خود ہی کہہ رہی ہو کہ وہ نور جہاں کے نام کا دیوانہ تھا۔ اس نے لیلا مجنوں اور شیریں فرہاد کے فسانے انسانی دنیا کو آنکھوں سے دکھا دیئے، مگر خدارا یہ تو بتاؤ کہ وہ کیسا نازک وقت ہوگا۔ جب اسی محبوبہ دلنواز کا بھائی جس کی ایک گردشِ چشم شہنشاہ کے واسطے ایک دور چرخ سے کم نہ تھی۔ مجرم کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو ایک طرف انصاف اپنی پوری طاقت کیسا تھ بارگاہِ جہاں گیری سے دادطلب ہے اور دوسری طرف محبت، بیگم کی دل آزاری کسی حال میں جائز نہیں سمجھ سکتا۔ اسلامی تاریخ اس فیصلہ پر جس قدر فخر کرے درست ہے۔ یہ فیصلہ وہ ہے جس کی نظیر کسی قوم اور کسی مذہب کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ فریضۂ عدل کی ادائیگی کے سامنے بیگم کے تمام تعلقات فنا ہو جاتے ہیں۔ مجرم کو سزا کا حکم دیتا ہے روتا ہوا اُٹھتا ہے اور بیگم کے ہاتھ کو بوسہ دیکر کہتا ہے " انصاف کا تقاضہ یہ ہی تھا کہ مجرم کو سزا دوں۔ اب محبت کا دعویٰ یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھ سے میری گردن اڑا دے "۔ آج کس کا منہ ہے جو شہنشاہ جہانگیر کے اس عدل کا ایک شمہ بھی اپنی تاریخ سے پیش کر سکے۔ یہ گوہر آبدار یہیں ختم نہیں ہوتے بلکہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دن بھر کا تھکا ہارا شہنشاہ قلعہ معلی میں داخل ہوتا

ہے۔ بیگم کھانا آراستہ کرتی ہے کہ قلعہ کے دروازہ پر کسی فریادی کی صدا بلند ہوئی۔ کھانا چھوڑ دیتا ہے تکان بھول جاتا ہے اور جس ابرو کی شکن پر سلطنت قربان تھی اسکو پامال کرتا ہوا فریادی کے پاس پہنچتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ بڑھیا عورت سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھر تھر کانپ رہی ہے۔ بادشاہ کی صورت دیکھتے ہی مظلوم عورت بلبلا اُٹھی۔ اور ایک منہ میں ہزاروں کوسنے دے ڈالے۔ قلعہ آگرہ کا دروازہ جس نے اپنی آنکھ سے یہ دردانگیز منظر دیکھا کہ رعیت کی ایک بڑھیا عورت ایک جلیل القدر شہنشاہ پر آزادانہ و بے باکانہ لعن طعن کر رہی ہے ابھی موجود ہے بڑھیا کی آتش غیض کسی طرح فرو نہ ہوتی تھی۔ اس کا جوش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا تھا وہ آپے سے باہر تھی اور کسی طرح خاموش نہ ہوتی تھی۔ کامل ایک گھنٹہ تک یہ جلیل القدر بادشاہ سر جھکائے اس بڑھیا کے سامنے کھڑا رہا۔ یہانتک کہ بڑھیا کی گفتگو ان الفاظ پر ختم ہوئی۔

" میری بہو کی عزت آج نصف شب کو تیرے کوتوال سعد اللہ خاں کے ہاتھ برباد ہو گی، صرف اتنا انتظام کر دے کہ ہم دونوں ساس بہو ایسی وقت اکبر آباد سے نکل جائیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے بعد ہم دونوں مظلوم ہستیاں تیری سلطنت میں قدم نہ رکھیں گی "

مفصل کیفیت پوچھنے کے بعد شہنشاہ نے جس وقت بڑھیا کو رخصت کیا سپید پوش عورت کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

" ناہنجار نورالدین میں جانتی ہوں کہ اب تو ہوگا نورجہاں ہوگی، ساغر ہوگا اور تجھے یاد بھی نہ رہے گا کہ رات کدھر آئی کدھر گئی، خیر میں جاتی ہوں لیکن یاد رکھ کہ اگر ہماری عصمت پر حرف آگیا تو قیامت کے روز جب میں اور تو دونو ایک لازوال طاقت کے روبرو ہوں گے۔ اس وقت میرا ہاتھ تیرے گریبان میں ہوگا "

بڑھیا کو ستی بنیتی چلی گئی۔ جہاں گیر غصہ میں کانپتا ہوا آیا کھانا اٹھوا دیا ایک عصا ہاتھ میں لیکر ٹہلتا اور روتا رہا، وقت مقررہ پر روانہ ہوا۔ سعد اللہ خاں کو کس طرح گرفتار کیا ایک طویل واقعہ ہے۔ مگر شہنشاہ جہاں گیر کے قصر حیات میں طلائی حروف ہمیشہ کندہ رہیں گے۔ کہ جب صبح کے وقت جلاد سعد اللہ خاں کی گردن اُڑا رہا تھا۔ تو اولو العزم بادشاہ نے تاج شاہانہ بڑھیا کے قدموں میں ڈال کر کہا۔

" تیری عصمت اس سے زیادہ وقعت رکھتی ہے "

آج زمانہ کی رفتار سے متاثر ہو کر تم ان مقدس ہستیوں میں جتنے جی چاہے کیڑے ڈال لو مگر زیادہ نہیں چند لمحوں کے واسطے کبھی تو غور کرو کہ جب وقت نے اسلام کے تمام جوہر فنا کر دیئے۔ انقلاب نے اس چمن کا ایک ایک پھول چھانٹ کر پامال کر دیا اور اس کے تمام والی وارث موت کے گھاٹ اتار دیئے تو آج یہ بے کس اتنی وقعت بھی نہیں رکھتا کہ اسکی عورتیں اپنی عفت و عصمت کو قائم رکھ سکیں۔

یہ ہندوستان کی کیفیت تھی جہاں آٹھ سو سال اسلامی حکومت رہی ہے اسلام کے جو حقوق ہمارے اوپر ہیں وہ اس لحاظ سے کہ دنیا کا ہر فرد شریک کلمہ ہے یکساں ہونے چاہئیں۔ لیکن ہماری زمین معمولی زمین نہیں ارض حجاز ہے اور ہمارے واسطے ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ کہ ہندوستان مسلمان عورتوں کی عصمت و عفت کی یہ کچھ وقعت کرے اور ہماری آنکھوں کے سامنے دشمن ناموس اسلام برباد کریں اور ہمارے کان پر جوں نہ چلے۔ اٹلی نے طرابلس پر جو مظالم توڑے ہم اس کو قیامت تک نہیں بھول سکتے۔ آج فرانس اسلام کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے اس کو سن کر اور دیکھ کر کونسا مسلمان ہے جس کی آنکھ سے خون کے آنسو نہ گریں گے لعنت ہے ہم پر ہمارے اعمال و افعال پر اور ہماری زندگی پر اگر ہم اس کے بعد بھی فرانس کی بنی ہوئی کسی چیز کا استعمال کریں۔ میرا جسم کانپ رہا ہے میرے

ہاتھ پاؤں اس خیال سے تھرا رہے ہیں کہ وہ کیسا وقت ہوگا۔ جب فرانس کے حکم سے دردزر قوم کی جو سچے مسلمان ہیں پامالی اور بربادی کی کوشش ہو رہی ہوگی خانماں برباد مردوں پر کیا گذر رہی ہوگی۔ اور بدبخت عورتیں ایک ایک کا منہ تک رہی ہوں گی۔ کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ بہن بیٹیاں رکھنے والا ہماری نہیں ہمارے ناموس کی اور ہماری نہیں ناموس اسلام کی حمایت کرے۔ میں کہتا ہوں اور پھر کہتا ہوں آسمان ٹوٹ پڑتا، زمین پھٹ جاتی۔ اس سے پہلے کہ آفتاب کی آنکھیں بساطِ زمین پر یہ تماشہ دیکھتیں۔

اس وقت تاریخ بہت دور لے گئی۔ اللہ اللہ اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ گذرے ہیں۔ بڑھیا کے قدموں پر تاج شاہی قربان کرنے کا فعل بھی شاہی تھا۔ اور اس قتل وغارت کے جو شام مراقش میں ہو رہے ہیں افعال بھی شاہی۔

روم کی زمین پر جب شہنشاہ فریڈرک نے سینکڑوں مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور قتل جائز سمجھا تو مامون الرشید کو جس وقت یہ خبر پہنچی ایک لشکر جرار سے حملہ آور ہوا۔ جس وقت قریب پہنچا تو روم کا ایلچی صلح کا پیام لاتا ہے۔ وقت ختم ہو گیا اور بات ابھی زندہ ہے۔ مامون کی ہڈیاں گل کر خاک سے بھی بدتر ہو چکیں ہیں مگر اس کا جواب ابھی موجود ہے۔ حالت طیش میں ایلچی کو سامنے بلوایا اور کہا جس وقت تمہاری فوج نے مظلوم عورتوں پر ستم توڑے اس وقت بے کسی و بے بسی کی حالت میں جس عورت نے اپنی عصمت بچانے کو آسمان کی طرف دیکھ کر یا محمدؐ کہا ہوگا اس کے اس نام کا معاوضہ روم کی پوری سلطنت بھی نہیں ہو سکتی۔

ایمان اس اعلان میں خاموش نہیں رہ سکتا کہ ملک کی تمام بسنے والیاں، محلوں دو محلوں والیاں پردے چلمن والیاں جو آج اطمینان سے بیٹھی ہوئی ہیں اپنی

بہنوں کیساتھ روسیاہ فرانس کا شکار ہو گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ جو ہماری عزت تک کو پامال کرنے میں تامل نہ کریں۔ ہماری حیا و غیرت کا تقاضہ یہی ہو کہ ہم اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے انکو مالا مال کریں اور اپنی صنعت و حرفت کو خاک میں ملا کر اپنے ملک و قوم کو بھیک منگوائیں، بیگم میری سچ مچ کی بیگم خدارا غور کرو مجھے اتفاق ہے کہ یہ فرانس کی لنگیاں اور سلیپں تمکو اور تمہارے لباس کو مزین کر رہی ہیں۔ مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ یہ چیزیں تمہارے جسم پر اخوت اسلامی اور اخلاص ہمدردی کو فنا کر کے آئی ہیں

میں خوش ہوا کہ میری محنت اکارت نہ گئی اور تم اسقدر متاثر ہوئیں مگر میں اب اتنا کہوں گا کہ قوم و ملک کی خدمت پر کمربستہ ہو۔ شرع اسلام نے عورت کو ضرورت کیوقت باہر آنکی اجازت دی ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ نازک وقت کبھی نہ آئیگا۔ کہ اسلام پر دشمنوں کا حملہ ہے۔ ہمارے گھر تباہ و برباد ہو گئے۔ ہماری مسجدیں اُجڑ گئیں، ہمارے بھائی خانماں برباد ہو گئے۔ اس ہوشربا ساعت میں عورتوں نے جو مردانگی دکھائی وہ آج کیا مدت العمر زندہ رہیگی۔ ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں بہنوں نے اپنے بچے اسلام کی لاج پر قربان کیے۔ ترکوں کی فتح میں مردوں کی شجاعت کتنی بھی ہو مگر اسکی تہ میں ان عورتوں کا ہاتھ تھا جنھوں نے اپنے لال نثار کیے اور پھول سے مکھڑے خاک و خون میں ملا دیئے۔"

آج شام کو جلسہ ہے سینکڑوں عورتیں جمع ہوں گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم اچھی طرح تقریر کر سکتی ہو اگر ہمت کرو تو میں دعوے سے کہتا ہوں اس سے زیادہ ثواب کا کام نہیں ہو سکتا۔ اور ملک و قوم کی خدمت میں تمہاری یہ جرات آب زر سے لکھنے کے قابل ہوگی، بسم اللہ کرو اٹھو، اور ملک پر قربان ہو جاؤ"

(۳)

"فاطمہ خانم ہماری رائے میں یہ چاروں جرم جن میں تمہارا چالان ہوا تمہارے برخلاف ثابت ہیں اور ہم فرد قرارداد جرم لگاتے ہیں۔ اگر تم صفائی پیش کرنا چاہو تو دوسری تاریخ مقرر ہو سکتی ہے۔ ورنہ ہم ابھی فیصلہ سنا دیں"

فاطمہ خانم "میں جس مقام پر کھڑی ہوں اس کو عدالت کہنا بیوقوفی اور سمجھنا اس سے زیادہ بیوقوفی

ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بیوقوفی کے دریا پھوٹتے ہیں حکومت کی بجلی کڑکتی ہے، رعونت کے بادل گرجتے ہیں اور ظلم و ستم کے طوفان بپا ہوتے ہیں کیسی صفائی کس کی فرد کہاں کی شہادت کدھر کی تاریخ۔ کیا میں تم سے یہ توقع کروں کہ تم انصاف کروگے۔ لاحول ولاقوۃ میں یہ بھی کہنا نہیں چاہتی کہ جو تقریر میری طرف منسوب کی گئی وہ قطعاً غلط، جس بدبخت منصف کو اتنا بھی نہ معلوم ہو کہ ایک شریف عورت ایسے مکروہ الفاظ جو دعوے میں مجوزہ ثابت کئے ہیں زبان سے ادا کرنے کے مقابلہ میں موت کو بہتر سمجھتی ہے۔ اس سے انصاف کی توقع کرنا توقع کرنے والے اور اس منصف کو منصف مقرر کرنے والے کی دانشمندی کا پورا ثبوت ہے حاکم صاحب آپ کو جو کچھ کل فرمانا ہے وہ آج ہی فرمائیے اور تکلیف انتظار نہ کیجئے میں جیل خانہ کے واسطے تیار ہوں سزا میری ناچیز خدمت کی تصدیق ہوگی۔ اور مبارک ہوگا وہ وقت جب مادر وطن کی گود سے مجھ جیسی سینکڑوں عورتیں پیدا ہوں۔ تم لوگوں نے جو ظلم و ستم ہم پر توڑے ہیں وہ تم اور ہم دونوں بھول جائیں مگر تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ تمہاری فرعونیت ابدالآباد تک زندہ رہیگی اور آئندہ دنیا تمہارے طرز حکومت کو سن کر دانتوں میں انگلیاں دبائیگی۔ بس منصف صاحب فیصلہ کیجئے کتنے سال کا حکم ہے؟"

عدالت۔ "اگر تم اپنے قصور پر نادم اپنی غلطی کی معافی مانگو تو ہم تمکو چھوڑ دینے کیواسطے تیار ہیں!"

فاطمہ خانم۔ "میں اور معافی؟ اسلئے کہ آپ کی سزا سے محفوظ رہوں میں اس عدالت سے جہاں کھڑی ہوں جیلخانہ میں جہاں جانیوالی ہوں زیادہ خوش رہوں گی!"

عدالت۔ "ان چاروں جرموں میں تم کو پندرہ پندرہ ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

اسوقت فاطمہ خانم نے اپنے شوہر خالد بے کیطرف دیکھا اور کہا اسوقت دور حکومت میں عورت کا اپنے گھر پر بیٹھ کر عزت قائم رکھنا بھی محال ہے اسلئے اجازت دیجئے کہ اپنی کامیابی پر آپ کی مبارکباد سنتی ہوئی آپکی آنکھوں کے سامنے ملت کی عنایت کا شکریہ ادا کروں اور چہرہ سے نقاب اتاروں!"

خالد بے۔ "مجھ کو جو مسرت اسوقت حاصل ہوئی الفاظ میں اسکا اظہار نہیں کرسکتا۔ اور نہایت خوشی سے تمہاری نقاب اس چہرہ سے جدا کرتا اور تمہاری مسلمان عورت کو خدا کے سپرد کرتا ہوں!"

(۳)

ریلوے اسٹیشن پر مردوں اور عورتوں کا ٹھٹ لگا ہوا تھا فاطمہ خانم حراست میں کھڑی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ پولس خود موقع پر موجود تھا۔ کہ ایک آٹھ سال کی بچی چھوٹا سا برقع اوڑھے دوڑتی ہوئی آئی یہ ابھی دوڑ رہی تھی کہ بدنصیب قیدن کے ہاتھ اس کو گلے لگانے کے لئے پھیل گئے۔ مردانہ وار آگے بڑھی کہ معصوم بچی کو چھاتی سے لگا کر رخصت کروں۔ بچی کے ہر قدم کے ساتھ جو آگے بڑھ رہا تھا۔ ادھر قیدن کی خواہش ترقی کر رہی تھی۔ اُدھر چھ ہفتہ کی چھوٹی ہوئی ماں کی صورت کا نظر آنا تھا کہ بچی بے تحاشہ دوڑتی ہوئی آئی۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ زمینی انسان اور آسمانی روحوں کی ٹکٹکی اس طرف بندھی ہوئی تھی۔ کہ بچی کا برقع اور ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ پاؤں کے سلیپر میں اٹکا۔ فرط مسرت میں بیہوش تھی۔ ہنستی ہوئی دوڑ رہی تھی کہ گری مگر قلب مضطرب کی اُمنگ تکلیف اور چوٹ پر غالب آئی۔ ننھا سا برقع سنبھالا چھوٹے سے سلیپر دوبارہ پہنے اور پھر لپکی ماں جو ایک طرف بچی سے چمٹنے کے لئے بے قرار تھی۔ دوسری طرف وہ خود نہیں اسکے جذبات ان اعضا کے استقبال کو جن میں چوٹ لگی تھی دبانے کے لئے آگے بڑھے اور اب دونوں ماں بیٹیوں میں چند قدم کا فاصلہ تھا کہ بالکل اسی طرح جب موسم بہار میں ایک طائر بے کس کے نشیمن پر بجلی کوند کر گرتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولس شفقت مادری کے تمام جذبات روندتا ہوا آگے بڑھا معصوم کی تمام اُمنگیں خاک میں ملادیں اور بیچ میں آکر بچی کے دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔

معصوم اور بے گناہ دونوں دل خاموش ہوئے دونوں زبانیں گنگ تھیں اور دونوں نظریں اس روسیاہ انسان کے چہرہ پر تھیں جس کا سینہ ان مقدس جذبات سے لبریز تھا اس سفاک ہستی کی پروا نہ کر سکا۔ اور فاطمہ خانم نے بیتاب ہوکر لڑکی کی طرف دیکھا کہ ایک خوفناک اور کرخت آواز نے اس کی اس اُمید پر بھی پانی پھیرا۔ گاڑی آگئی

اور جس طرح ایک چرواہا اپنی لکڑی سے گائے بکریوں کو ہکاتا ہے پولس کپتان اپنے چابک کے اشارے پر فاطمہ خانم کو لے کر چلا باوجود انتہائی کوشش کے بدنصیب کو یہ اجازت نہ دی گئی۔ کہ وہ بچی کا الوداعی پیار کرکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرلیتی۔ یا شوہر سے مصافحہ کرکے رخصت ہوتی، ان دونوں کوششوں میں ناکامی کا یقین ہونے پر اس نے منہ موڑ کر بچی کو دیکھا اور کہا :- "پیاری مغیرہ بس گھر جاؤ۔ خدا تمہارا نگہبان ہے"۔

مزاج میں ہزار تحمل اور طبیعت میں لاکھ استقلال تھا۔ مگر اس وقت بچی کو رخصت کرنے میں فاطمہ خانم کی آواز تھرتھرا گئی۔ اس نے شوہر کی طرف دیکھکر کہا :

"آقائی فی امان اللہ مغیرہ فاطمہ خانم کی یادگار تمہیں۔ اس بیوی کی امانت ہے جو دونوں باپ بیٹوں کی خدمت گذار تھی، آقا بن ماں کی بچی کو دغا نہ دینا، اگر ضرورت مجبور کرے تو قبل از نکاح اسکو میرے میکے بھیجدینا، خدا حافظ دونوں باپ بیٹیوں کو خدا کے سپرد کیا"۔

(۴)

"یہ پورا سال کس طرح گذرا تم جانو یا نہ جانو مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں موت میری اس زندگی سے بدرجہا بہتر تھی۔ اور اگر یہی زندگی کا مقدر ہے تو خدا مجکو اٹھالے خالد میں تمہاری اولاد نہیں تمہاری ماں ہوں اور حق رکھتی ہوں۔ کہ تمہاری خواہش کے خلاف اپنی ضرورت سے تم کو مجبور کروں۔ اور تمہارا فرض ہے کہ خواہ بہ خوشی و رضامندی یا بہ جبر و اکراہ، میرے حکم کی تعمیل کرو، میں دیکھ رہی ہوں کہ فاطمہ کی قید نے تمہاری زندگی برباد کردی وہ شوق سے چھوٹ کر واپس آئے اور تم خوشی سے اس کو گھر میں رکھو۔ مگر پانچ سال تک کیا ہوگا۔ اور جب اس کو یہ لپکا پڑ گیا۔ تو وہ یہاں کتنے دن ٹھہریگی۔ پھر وہی جیل خانہ اور وہی فاطمہ خانم، منہ کا لگا خون اور ہاتھ کا پڑا لپکا چھوٹنے والا نہیں۔ یہ تو قبر میں جاکر چھوٹتا ہے۔ مرد کی زندگی اور گھر کی رونق

صرف عورت کے دم سے ہے۔ لنڈورا آدمی خانہ بدوش ہے تم جو یہ مصیبت
اُٹھا رہے ہو تو کس توقع اور بھروسہ پر اور مصیبت کی بھی تو کوئی حد ہو جینا
ہی بیکار ہے۔ روٹی ہے نہ ٹکڑا۔ اور کپڑا ہے نہ لتا۔ باورچی ایک نہیں تم چار رکھ لو
مگر وہ بیوی کا آرام کہاں کہ کھلا کر کھائے اور سلا کر سوئے، پرسوں ہی کبابوں میں
نمک زہر تھا۔ تم اتنے بگڑے وہ سُن سُنا پڑ کر ڈھیٹر ہو گیا۔ میں عشا کو گئی ہوں۔ تو
خراٹے لے رہا تھا۔ بھلا بیوی ہوتی تو تم بھوکے سوتے، تم نے اپنے ساتھ میری اور
بچی کی بھی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ پانچ برس بعد نہ معلوم کس راجہ کا راج ہو۔ کون مرتا ہے
اور کون جیتا ہے۔ تم کو اپنی طبیعت کا اختیار سہی مگر یہ حق تو نہیں ہے کہ اس بڑھاپے
میں میری مٹی پلید کر دو۔ غضب خدا کا صبح سے ادن پانی پی رہی ہوں کوئی اتنا
نہیں کہ باسی پانی کی صراحی بھر کر رکھ دے۔ اگر تم چچا جان کے ہاں نکاح نہیں
کرنا چاہتے تو اور ہزار لعل لڑکیاں موجود ہیں۔ مگر یہ چاہو کہ دادا پردادا کی چوکھٹ پر
اندھیرا پڑا رہے تو یہ ہونا نہیں۔ اس گھر میں تو سدا بہو کے ہاتھ کا چراغ جلا اور جلیگا
لڑکی سیانی ہو رہی ہے۔ دو تین برس میں اس کا وقت آ رہا ہے تمہارے پاس
جہیز کے تام جھام اٹک نہیں۔ یہ بغیر عورت کے کس طرح ہو سکتا ہے بھائی تم
اچھے ملک اور قوم کے خدمت گذار پیدا ہوئے۔ کہ بزرگوں کی آبرو برباد کی۔ میری مٹی
تم نے پلید کی، گھر کا گھر وا تم نے کیا، بچی کی عمر تم نے تباہ کی، سچ یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ
بدنصیب دنیا میں کوئی نہیں، سال بھر کی بیاہی رانڈ ہوئی کھانے پینے کے دن اور ہنسنے
بولنے کی عمر تھی مگر دن تو کیا کوئی گھڑی بھی چین کی نہ کٹی۔ رنڈاپا سب کی آنکھ کے
سامنے اسی دہلیز پر کاٹ دیا۔ سارا جوبن گھلا لو، جب ایک لالہ پالو۔ جوانی خاک
میں ملا کر تم کو جوان کیا کہ آخری عمر میں تمہاری طرف سے ٹھنڈی ہوا آئیگی۔ تم نے
نہیں مگر تمہارے گنوں نے جلا کر خاک کر دیا۔ میاں مجھے تو اب جینا اجیرن زندگی پہاڑ

اور رہا مصیبت ہے تم اس کان سنو چاہے اُس کان۔ ملک کی خدمت کرو۔ چاہے قوم کی لیکن نکاح نہ کیا۔ تو خیر میں ترستی پھڑکتی مصیبت پیٹ کر اور پاٹڑ بیل کر اپنے دن پورے کر ہی جاؤں گی مگر یاد رکھنا کل قیامت کے دن تمہارا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ "۔

(۵)

جیل خانہ کے زنانہ وارڈ میں افسران پولس ایک نوجوان لاش کو غور سے دیکھ رہے اور افسوس کر رہے تھے کہ اس تقریر نے ان کا افسوس اور رنج سب غارت کر دیا۔
" ثبوت کی ضرورت ہے نہ صفائی کی اور گواہ کی حاجت ہے نہ شاہد کی، مجھ کو اقرار ہے اور تم چار کے سامنے کیا ہزار کے، یہاں کہوں، عدالت میں کہوں، کھلے خزانہ کہوں۔ ہانکے پکارے کہوں۔ اس مردود کی قاتل میں، ہیں بیشک میں! تم انسان نہیں حیوان ہو کہ اس کی جوانی پر افسوس کرتے ہو۔ یہ جوان نہیں شیطان تھا۔ کہ اس نے میری عزت پر نظر ڈالی، مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کی نگاہ میں عصمت کی کوئی وقعت نہیں۔ مگر اپنی رائے کو پھونک دو۔ اور اس کی وقعت ہمارے دل سے پوچھو۔ ایک سپرنٹنڈنٹ کیا ہزاروں داروغہ ہوتے تو اسی کھرپے سے جو گھسیارن یہاں رکھ جاتی ہے میں سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ یہ عورت کا وہ جوش ہے جس کے سامنے فوجیں تباہ و برباد اور سلطنتیں تاخت و تاراج ہوگئیں۔ وحشیوں تم کو یہاں آئے ایک صدی سے زیادہ ہوئی مگر آج تک تم ہماری عصمت کا مرتبہ نہ پہچان سکے، تم نے دو چار جگہ نہیں بیسیوں جگہ اور ایک آدھ کو نہیں ہزاروں کو اس کسوٹی پر پرکھ لیا۔ مگر اب تک نہ سمجھے کہ ہم کیا ہیں، تم نے مجھکو قید کیا تھا۔ تم مجھ سے محنت بے مشقت لیتے! اسلئے کہ قید کے بہانے سے ہماری آبرو برباد کرو۔ سپرنٹنڈنٹ ملعون کو کانی سزا مل گئی۔ مگر جو ذمہ داری جو الزام جو دھبہ تم پر تمہاری حکومت پر تمہاری سلطنت

تو ماں ہی بٹھا سکتی ہے۔ میرے ساتھ دنیا کے ہزار جھگڑے ہیں۔ اپنا گھر کیونکر چھوڑ
دوں... مجھے سب خبر ہے۔ کہ لڑکی نے آفت ڈھا رکھی ہے میں نے بیسیوں اور
سینکڑوں لڑکیاں پڑھا ڈالیں۔ جو اللہ رکھے آج گھر میں برتتی ہیں۔ پوتا پوتی نواسا
نواسی والیاں ہیں۔ مگر ایسی بس کی گانٹھ نہیں دیکھی کہ جیدے۔ کچھ غضب آگیا
بھلا میاں بیٹی ذات پرایا گھر دیکھنا اور دوسری ماں بنتی آسان نہیں تم نے
اپنی ضد کے کارن لڑکی کو تھپیڑوں کے بیچوں بیچ پہنچا دیا۔ اور ایسا ناس کیا کہ
ساری دنیا میں تھڑی تھڑی مچ گئی۔ اگر اس طرح بیٹیاں پل جائیں تو پھر بیویوں
کو پوچھے کون۔ ہم سے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ یہ چلن اچھے نہیں۔ تم نے
اس کان سنا اس کان اڑا دیا۔ اب تمہارا مانو یا بھلا ہاتھی کے دانت نکلے سو
نکلے سیانی بیٹی، ہاتھ نہیں اٹھا سکتے عمر بڑی کہیں بٹھا نہیں سکتے۔ یہ تو جب
تک گھر والی نہ ہو جو آٹھوں پہر اس کو آنکھوں میں رکھے۔ یہ ٹھیک ہونے والی
نہیں۔ میں نوکر آدمی ہوں مگر نمک کھایا ہے، ایمان کی بولوں گی۔ سنوں گی تو جلوں گی
اور جلوں گی تو کہوں گی اماں کی آنکھوں میں پانی تم نے اتروا دیا۔ کہ ہر وقت روتے
روتے اندھی ہو گئیں۔ بیٹی کی عمر پر بات تم نے کی کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا اور اب
بھی نکاح نہیں کرتے کہ بڑھیا، کہ جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے کچھ تو آرام مل جائے
تم کمیسریٹ ہر دن گھر سے باہر رہتے۔ رات کو آتے اور پڑ رہتے ان بچاری کی دیکھ
بھال کون کرے۔ ایسے درد سے روتی ہیں کہ سننے والوں کا کلیجہ پھٹتا ہے۔"

استانی کا جواب سن کر خالد تھا مشن ہو گیا۔ ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور
آدمی کو آواز دے کر کہا۔ "چار بج چکے تھے۔ پانچ بجے مجھے اسٹیشن پر پہنچنا ہے
پانی غسل خانہ میں رکھ دو۔ کپڑے ٹھیک کر لئے؟"

ملازم۔ "دو دفعہ بلال کے پاس جا چکا ہوں اس کا پتہ نہیں دوسرے

بھشتی سے بھی کہا وہ کمبخت اپنے اپنے ٹھکانوں میں بھر رہے ہیں ۔ میں اس وقت کھانا کھلانے چلا گیا ۔ مکان بند رہا ۔ پانی بھرا نہیں گیا ۔ اب پھر جاتا ہوں ۔"

خالدہ "لاحول ولا قوۃ جاؤ جلدی جاؤ اور کپڑے نکال دو ۔"

ملازم "سیاہ جبّہ آپ نے فرمایا تھا وہ نکال لیا ۔ لیکن اس کا گریبان ادھیڑ رہا ہے وہ بھی درزی کے ہاں لے جا رہا ہوں ۔"

خالدہ ۔ "قہوہ لاؤ"

ملازم ۔ "بہت بہتر ۔"

(۷)

روزانہ فریخ ادسٹ لک مورخہ ۲ رجون

مشہور مسلمان لکچرار فاطمہ جو اپنی تقریر کے جرم میں سزائے قید بھگت رہی ہے ۔ کل یکم جون کو عدالت سشن میں داروغہ جیل کے قتل کے جرم میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزایاب ہوئی ۔

(۸)

" آج برادر مرحوم زندہ ہوتے تو مجھے اس قدر اصرار کی ضرورت نہ تھی میرے عزیز بھتیجے میرے پیارے بیٹے میرے سعادتمند بچے تم فاطمہ جیسی بیوی کی زندہ موت کا جس قدر سوگ کرو کم ہے ۔ ہم تو اپنے ہیں اس کی سزا تو غیروں کو خون کے آنسو رلا ئیگی اتنے دن ہو گئے ۔ مگر اس کی تصویر اب تک آنکھوں میں پھر رہی ہے ۔ میں خود اس تقریر میں موجود تھا ۔ [illegible] تھا ۔ اب بھی کہیں جلسہ میں جب مختل تقریر کا اتفاق ہوتا ہے نام آ جاتا ہے ۔ دنیا سرد سی لگتی ہے وہ عورت نہیں ایک نعمت تھی جو تم سے چھن گئی ۔ جب تک اس کی واپسی کی اُمید تھی باوجود بھائی جان کے متواتر تقاضوں کے تمہارے منہ پر

نہ رکھا۔ میں جانتا تھا تمہارا دل زخمی، تمہاری طبیعت مضطرب اور تمہاری حالت خراب ہے۔ میری تجویز اس زخم پر کچھ کے اس کاٹے پر نمک اس جلے پر تیل ہوگی۔ مگر اب جب امیدیں منقطع اور توقعات ختم ہوگئیں تو میرا فرض یہ ہے کہ تم کو صلاح دوں ترغیب دوں مجبور کروں اور جس طرح بھی ہو تمہارا گھر آباد کروں۔ یوں زندگی کب تک بسر کروگے اور انجام کیا ہوگا۔ کچھ بھی ہو آخر مسلمان ہو اور اسلام میں موت پر ایسا صدمہ مشیت کی مخالفت ہے اور یہی ہیں وہ صورتیں جو آدمی کو "خسر الدنیا و الآخرہ" کا مصداق کردیتی ہیں میرا بھی اب آخری وقت ہے اس سکنی مکان کے علاوہ تیغ والے باغ کے ڈیڑھ لاکھ مل رہے ہیں۔ میرے بعد بھی جب وارث تم ہی ہو تو زندگی ہی میں کیوں نہ لو، لو یہ قبالے لو خدا تم کو نصیب کرے۔ کچھ چھان بین کی بھی ضرورت نہیں خود میری لڑکی صفیہ موجود ہے۔ بیٹا کوئی دن کا مہمان ہوں دل کی دعا لو۔ اور مجھے خوش کر جاؤ۔ اماں کے کلیجے سے لگو میں شادی کا انتظام کرتا ہوں ۲۷ر تاریخ سعید ہوگی"۔

(۹)

جزائر مداغاسکر میں ساحل سمندر پر دوپہر کے وقت فاطمہ خانم بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے، دفعتاً چونک پڑی کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "سپرنٹنڈنٹ کیسا ہی نامعقول آدمی کیوں نہ ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس تذکرہ کا بڑا حصہ معقول تھا میں خوب سمجھتی ہوں کہ میری رہائی کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنی آنکھ سے دیکھ لوں کہ ملک و قوم تو درکنار خود اس شوہر نے جو اس انقلاب کا محرک تھا میری خدمات کی کہاں تک قدر کی اگر خالد کی غرض یہ نہ تھی کہ وہ اس طرح صفیہ سے نکاح کرنے میں کامیاب ہو تو یہ ضرور تھی کہ مجھ کو سیاست کی

سفید چادر اوڑھے نمودار ہوئی اس نے اپنا منہ کھولا اور خالد سے کہا۔

"تمہاری دلہن خدا تم کو نصیب کرے مگر میری دلہن کہاں"؟

فاطمہ خانم کی صورت دیکھتے ہی خالد تھرا اٹھا دیوانہ وار چلایا اور مجنونانہ آگے بڑھ کر اس کو بوسہ دیا اور کہا۔

"پالکی کا پردہ اٹھا کر دیکھو دولہن کس کی؟"

فاطمہ جھکی پردہ اٹھا کر دولہن کا گھونگھٹ اٹھایا تو وہ صورت نظر آئی جس کے واسطے دل تڑپ رہا تھا۔ کلیجہ سے چمٹا کر روئی اور بآواز بلند کہا۔

"خالد! دولھن دونوں کی"

دروازہ میں گلی میں صحن میں کوٹھوں پر سڑکوں پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ کہ خالد نے اندر سے دولھا کو بلایا اور کہا" میاں یہ تمہاری دولھن خدا تم کو نصیب کرے" اس کے بعد اس نے فاطمہ خانم کے قدم چومے اور بآواز بلند کہا:۔

"یہ قدم سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں"

اتنا کہہ کر اس نے چچا کی طرف دیکھا جیب میں سے قبالے نکالے اور کہا "یہ آپ کو مبارک ہوں موت اس سے بہتر تھی کہ میں فاطمہ خانم کے بعد دوسرا نکاح کرتا"۔ آج نکاح مغیرہ کا تھا۔ دونوں میاں بیوی رو رو کر گلے ملے اور ایک دفعہ اسی حالت میں خالد نے پھر سوال کیا:۔

"بیگم دلہن کس کی"

اب فاطمہ خانم کے اس جواب کے ساتھ حاضرین کی متفقہ آواز تھی۔

دولہن دونوں کی

ختم شد

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کی تازہ تصنیفات

آمنہ کا لال

اردو زبان کا سب سے بہتر مولود شریف حضرت
علامہ محترم کی تازہ تصنیف جس کا کئی کئی سال
سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو انتظار تھا نہایت آب
وتاب کے ساتھ چھپ کر تیار ہے اب پڑھی لکھی
عورتوں کی مجالس میلاد میں یہی کتاب پڑھی
جاتی ہے اور وہ اپنی غیر مسلم سہیلیوں کو بڑے
فخر کے ساتھ بلاتی ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد
بڑے ذوق وشوق سے آمنہ کے لال کا مطالعہ
کرتے ہیں کیونکہ اس میں ایک واقعہ بھی ایسا
نہیں جو خلاف عقل کہا جا سکے نثر کے ساتھ ساتھ
جہاں جہاں نظم ہے وہ بھی اس قدر موثر ہے
اہل دل تڑپ اٹھیں کیونکہ تمام اشعار خود
علامہ محترم ہی کے ہیں۔ آمنہ کے لال میں علامہ
راشد الخیری کا بہترین لٹریچر ہے۔ بہت خوبصورت
ٹائٹل دبیز کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی۔

قیمت ایک روپیہ

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے
ہو سکتا ہے کہ ایک سال میں تیسری بار چھپی ہے

ابھی تک اس قدر مفصل اور مکمل درد انگیز اور موثر
بیان کسی کتاب میں نہیں تعلیم یافتہ عورتیں اور
خواہ شیعہ ہوں یا سنی شہادت کی یہی کتاب اب پڑھتے
ہیں مجلسوں میں پڑھوانے اور سننے میں ضخامت قریبا
ڈھائی سو صفحے۔ قیمت عا مجلد عا قسم دوم عہ مجلد
عہ قسم خاص آرٹ پیپر
بے مجلد عہ

سیدہ کا لال

شہادت کی مکمل ومفصل تاریخ حضرت علامہ محترم
کی بے مثل نئی کتاب حصہ اول مکمل تاریخ شہادت
ہے حضرت امام حسینؑ کی نانی ام المومنین حضرت
خدیجۃ الکبریٰ کے اسلام پر احسانات جناب سیدہ
کے فضائل سرور کائنات صلعم کی رحلت حضرت عثمانؓ
حضرت علی کی شہادتیں اور دردناک مرثیے، جنگ
جمل جنگ صفین کا مکمل بیان شیعہ سنی اختلافات کی
ترقیاں، بنی امیہ کی کوششیں، امیر معاویہ کی سیاست
امام حسن کی شہادت یزید کی حکومت کی پوری کیفیت
غرض پہلے حصہ میں معرکہ کربلا سے پہلے کے تمام صحیح مستند
واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جن سے
واقعہ کربلا کے صحیح اسباب ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔
دوسرا حصہ مراثی کربلا ہے حضرت مسلم اور ان کے بچوں کی
شہادت سیدہ کے لال کی مدینہ سے روانگی حضرت حر
کی شہادت بی بی زینبؑ کا میدان کربلا میں بے مثل ایثار
ان کے بچوں کی شہادت حضرت عباس کی شہادت حضرت
قاسم کی شہادت حضرت علی اکبر کربلا کا ننھا شہید بیان
اصغر کا قاصد۔ سیدہ کے لال کی شہادت خاندان نبوت
سیدانیاں۔ ابن زیاد اور یزید کے دربار شیعہ سنی اختلافات
پر تبصرہ۔ قاتلان حسین کا انجام اور خدائی فیصلے۔ یہ
تمام کتاب اس قدر درد انگیز ہے کہ بغیر آنسو بہائے نہیں
پڑھی جا سکتی۔ مگر نثر میں جو مرثیے علامہ محترم نے لکھے ہیں
ان کی ایک ایک سطر کلیجہ کے پار ہو جاتی ہے۔ آمنہ کے لال
کی طرح سیدہ کے لال میں بھی کوئی واقعہ خلاف عقل نہیں ہے
ادب لطیف کے علاوہ جو شہادت کی جان ہے شہادت ۴

ملنے کا پتہ ۔ دفتر عصمت دہلی